بدلتی دُنیا کے تقاضے

مصنف شوما خر

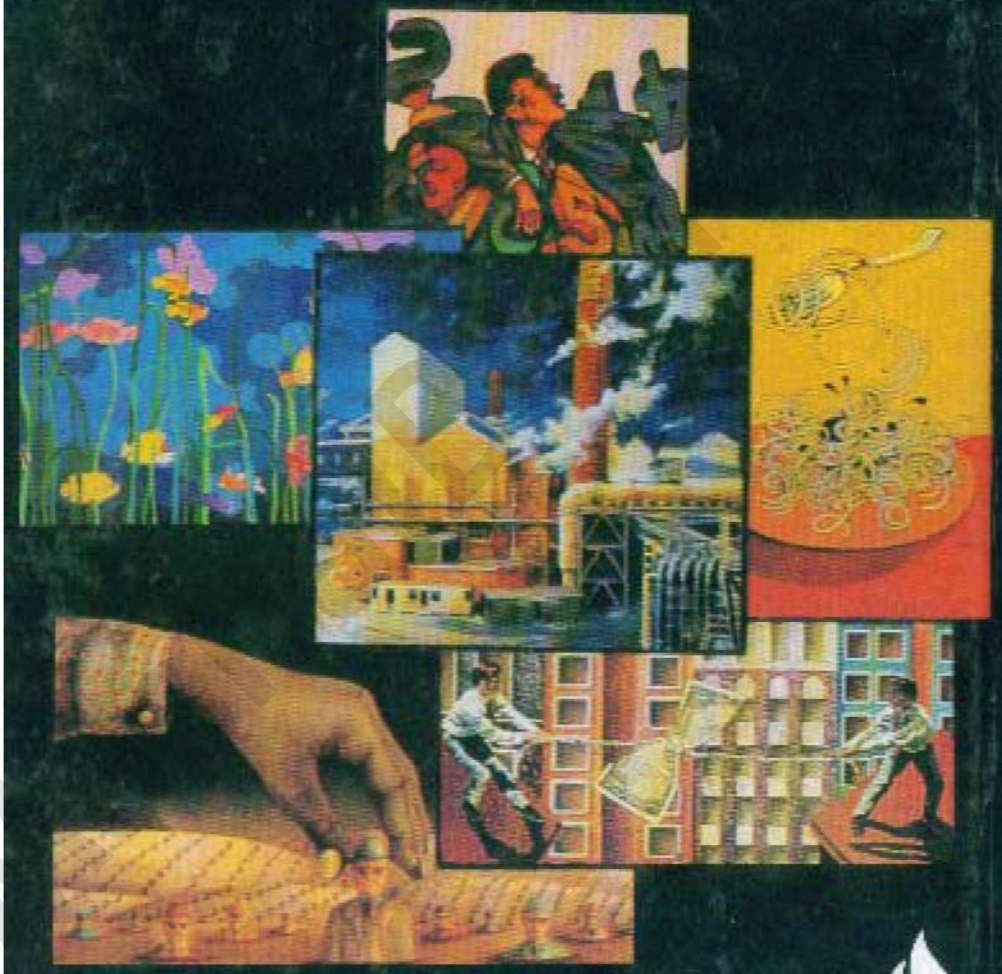

مترجم ڈاکٹر سجاد باقر رضوی

بدلتی دنیا کے تقاضے

شوماخر

مترجم: سجاد باقر رضوی

مشعل بکس

آر بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور۔54600، پاکستان

MashalBooks.com

E.F Schmacher: Small is Beautiful
Copyright, English 1974: Abacus
Copyright, Urdu 1991: Mashal Pakistan
Urdu Translation: Dr Sajjad Baqir Rizvi

ای۔ایف۔شوماخر: بدلتی دنیا کے تقاضے
کاپی رائٹ 1974ء انگلش: ایبکس
کاپی رائٹ 1991ء اردو: مشعل پاکستان
اردو ترجمہ: ڈاکٹر سجاد باقر رضوی

MashalBooks.com

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
1	پیش لفظ	5
2	پیداوار کا مسئلہ	14
3	امن واستحکام	20
4	معیشت کا کردار	30
5	بدھ اقتصادیات	36
6	عظیم وسیلہ۔تعلیم	50
7	زمین کا صحیح استعمال	64
8	صنعتی وسائل	73
9	ایٹمی توانائی۔نجات یا لعنت	79
10	ٹیکنالوجی کا انسانی چہرہ	85
11	تیسری دنیا	93

MashalBooks.com

12	معاشرتی اور معاشی وسائل	98
13	بھارت میں بیروزگاری کا مسئلہ	117
14	تنظیم اور ملکیت	126
15	کچھ بڑے پیمانے کی تنظیم کے نظریہ کے بارے میں	137
16	سوشل ازم	145
17	ملکیت	151
18	ملکیت کے نئے نمونے	156
19	حرف آخر	166

MashalBooks.com

دوسرے قسم کا ڈیویلپمنٹ

اکثر چھوٹی کتابیں انقلابی ثابت ہوتی ہیں، مثلاً روسو کی کتاب ''سوشل کونٹریکٹ'' یا کارل مارکس کی ''کمیونسٹ'' یا پھر ہمارے زمانے میں پاؤلر فریرے کی مختصر کتاب ''پیڈ گوجی اوف دی اوپر یسڈ''۔ ارنسٹ شوماخر کی کتاب ''سمال از بیوٹی فل'' بھی تقریباً اسی زمرہ میں آتی ہے یہ کتاب ڈیویلپمنٹ تھیوری اور عمل میں اس نئی تحریک کا نقطہ آغاز تھی جو ''آلٹرنیٹیو ڈیویلپمنٹ'' (Alternative Developmnt) یا ''دوسرے قسم کا ڈیویلپمنٹ'' کے نام سے پہچانی جاتی ہے اور جو ترقی پذیر ملکوں کے کروڑہا عوام کے لئے ایک نئی امید لے کر آئی ہے۔

اگر میں نے شوماخر کی کتاب کے لئے ''تقریباً'' کا لفظ استعمال کیا تو وہ اس لئے کہ اس میں مغربی دنیا کی سرکاری (Official) معاشی آئیڈیولوجی پر جو تنقید ہے وہ بذات خود کوئی نئی نہیں۔ یہ تنقید انیسویں صدی میں کارل مارکس کے معاشی فلسفے کی بنیاد تھی اور اس کو بیسویں صدی مارکسی سوشل فلسفے کے فرنیکفرٹ سکول نے خاص کر میکس ہورکہائیمر اور تھیوڈور ادورنو نے صرف سرمایہ داری نظام کے خلاف ہی نہیں بلکہ صنعتی تہذیب کے خلاف استعمال کر کے مزید گہرا کر دیا تھا۔ ادھر ایک اور سمت سے، اور تیسری دنیا کے پس ماندہ عوام کے نقطہ نظر سے لکھتے ہوئے، گاندھی نے سرمایہ داری نظام اور صنعتی معاشرے کی زبردست مخالفت کی اور دیہاتوں اور چھوٹے پیمانے کی ٹیکنولوجی پر مبنی ایک نئے معاشی نظام کا تصور دیا۔ یہ سب نظریات شوماخر کے خیال کے لئے جڑوں کی حیثیت رکھتے ہیں، خاص کر گاندھی کا تصور، جس کے اثر کو شوماخر نے خود تسلیم کیا ہے۔

بہرحال جب کہ گاندھی کا پیغام یہ تھا کہ صنعتی معاشرے کو بالکل رد کر دیا جائے اور غریب ملکوں کی فلاح اس میں ہے کہ وہ روائتی پیداواری طریقوں اور لائف سٹائل کی طرف پیچھے لوٹ جائیں، شوماخر کو یہ احساس تھا کہ خرابی صنعتی نظام کی نہیں ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ کس قسم کا صنعتی نظام اپنایا جا رہا ہے۔ اس کی توجہ اس بات کو ثابت کرنے پر مرکوز تھی کہ جس قسم کی ٹیکنولوجی اور صنعتی اور معاشی نظام مغربی ملکوں نے وضع کیا ہے وہ پس ماندہ اور غریب معاشروں کے لئے موزوں نہیں۔ ان کی ضروریات کے لئے ایک اور ہی قسم کی ٹیکنولوجی اور صنعتی اور گنائزیشن کی

MashalBooks.com

ضرورت ہے۔ یہ تھی وہ نئی بات جو ''انقلابی'' ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر ارنسٹ۔ ایف۔ شوماخر جرمنی میں پیدا ہوا تھا اور اس نے انگلستان کی یونیورسٹی آکسفورڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ صرف بائیس سال میں ہی اسے نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں اکنومکس پڑھانے کے لئے منتخب کرلیا گیا۔ لیکن وہ محض ذہنی کام سے مطمئن نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ اس کام کو عملی زندگی سے منسلک کرے۔ چنانچہ اس نے یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑ کر بزنس، فارمنگ اور جرنلزم کے تجربے حاصل کئے۔ پھر 1946ء سے 1950ء تک جرمنی میں برٹش کنٹرول کمیشن کے اکنومک ایڈوائزر کی حیثیت سے اس کا تقرر ہوا اور اس عہدے پر اس نے 1970ء تک کام کیا۔

اسی دوران شوماخر نے اپنی نئی تھیوری کی بنیادیں ڈالیں۔ 1961ء میں بھارت کے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے اسے بھارت آنے کی دعوت دی اور اس کے ذمہ یہ کام سپرد کیا کہ ہندوستان کے گاؤں کا دورہ کر کے وہ انڈین پلاننگ کمیشن کو یہ مشورہ دے کہ ہندوستانی دیہاتوں میں جو مسائل ہیں ان کو کس طرح حل کیا جائے۔ یہ تھا ایک پسماندہ ملک کا براہ راست تجربہ جس نے ''انٹرمیڈیٹ ٹیکنولوجی'' یا ''درمیانی ٹیکنولوجی'' کے تصور کو جنم دیا۔

اس ''تجربہ'' کی کیا نوعیت تھی؟ دراصل انٹرمیڈیٹ ٹیکنولوجی کے تصور کی اہمیت کو اسی وقت صحیح طور پر سمجھا جاسکتا ہے کہ جب کہ ہمیں یہ اندازہ ہو کہ تیسری دنیا میں حکومتوں کی طرف سے کئے جانے والے ''معاشی ڈیلوپلمنٹ'' کے نتیجے پر کیا صورت حال پیدا ہو رہی تھی۔ پول ہیریسن نے اپنی کتاب ''دی تھرڈ ورلڈ ٹو مورو'' میں اس صورت حال کی نشاندہی کی ہے۔

سب سے نمایاں طور پر نظر آنے والی صورت حال تو یہ تھی کہ، انٹرنیشنل لیبر اورگنائزیشن (ILO) کے اعدد شمار کے مطابق 1977ء میں تیسری دنیا میں کوئی 331 ملین افراد بے روزگار تھے، یعنی ہر پانچ کام کرنے کے قابل افراد میں دو ایسے تھے جن کے پاس روزگار نہیں تھا۔ ان میں سے 40 ملین ایسے تھے جو مکمل طور پر بے روزگار تھے اور ان میں سے زیادہ تر شہروں میں پائے جاتے تھے۔ باقی کے جو 291 ملین بے روزگاروں کا جم غفیر تھا وہ دیہاتوں میں پایا جاتا تھا اور ان لوگوں کو کبھی کام ملتا تھا کبھی نہیں۔

ILO نے یہ تخمینہ لگایا کہ سنہ 2000 تک بے روزگاروں کی تعداد ایک بلین تک جا پہنچے گی۔ ان میں سے آدھی تعداد کو زرعی اصطلاحات کر کے، آب پاشی کے نظام میں توسیع کر کے،

اور بہتر بیجوں اور کھادوں کو مہیا کر کے دیہاتوں میں کام دلانا ہوگا۔ دوسری بڑی تعداد کو سروسز سیکٹر میں کام مہیا کرنا ہوگا، لیکن تقریباً ایک چوتھائی روزگار کی صنعتوں کے شعبے میں پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی۔

چنانچہ تیسری دنیا کے بیشتر ملکوں نے نئے روزگار نکالنے کے لئے جو سٹرٹیجی اپنائی وہ یہ تھی کہ انہوں نے مغربی طرز کی بڑے پیمانے کی صنعتیں لگانا شروع کر دیں جن کے لئے مغرب سے درآمد کی ہوئی مشینری اور ٹیکنولوجی درکار تھی۔ یہ ٹیکنولوجی مغربی ممالک میں پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں جو مخصوص حالات تھے ان کے مدنظر تیار کی گئی تھی۔ اس وقت لیبر کی قلت تھی لیکن انوسٹمنٹ کے لئے کافی سرمایہ تھا۔ ان حالات میں کیپٹل انٹینسیو (Capital Intensive) ٹیکنولوجی کا استعمال سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ لیکن غریب ملکوں کی صورت حال یہ تھی کہ وہاں فاضل محنت کشوں کا ایک جم غفیر تھا اور سرمایہ کی انتہائی قلت تھی، اور ہے۔ دوسری طرف چونکہ مغربی ٹیکنولوجی کی قوت پیداوار زیادہ تھی اس لئے وہ کام کرنے والوں کو نسبتاً اچھی اجرتیں ادا کر سکتی تھی، خاص کر ان لوگوں کو جو ٹیکنکل سکولوں اور کالجوں سے مختلف قسم کی ہنرمندیاں سیکھ کر نکل رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محنت کشوں کے طبقے کے اندر مالی اعتبار سے غیر برابریاں بری طرح بڑھ گئیں۔

مزید یہ کہ اس ٹیکنولوجی کے مراکز شہر تھے، شہروں کی آمدنیوں میں دیہاتوں کی آمدنیوں کی نسبت کئی گنا اضافہ ہو گیا جس کے باعث دیہات کے باشندوں کی شہروں کی طرف مائگریشن میں تیزی آ گئی۔ اور یہ مائگریشن اور بھی شدید اس لئے ہوا کہ حکومتوں نے معاشی ترقی کے لئے جو انوسٹمنٹ کیا اس میں بھی شہروں اور صنعتوں کو دیہاتوں اور زراعت کے مقابلے میں بڑے پیمانے پر ترجیح دی، جس کے باعث زرعی ترقی کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ سست پڑ گئی۔ اس سارے پروسس کا مزید نتیجہ یہ ہوا کہ پس ماندہ ممالک اپنی معیشت کی گروتھ کو برقرار رکھنے یا اس میں اضافہ کرنے کے لئے زرمبادلہ یا فارین ایکسچینج کو کمانے اور صرف کرنے کے منحوس چکر (Vicious circle) میں پھنس گئیں اور بری طرح مغربی ممالک اور مغربی ٹیکنولوجی کے غلام ہو کر رہ گئے۔

تیسری دنیا میں 1953ء اور 1975ء کے درمیان صنعتوں نے تیزی سے ترقی کی لیکن چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ ٹیکنولوجی اور بھی پیچیدہ اور سوفسٹی کیٹڈ Sophisticated ہوتی گئی

اس میں جو روزگار کے مواقع پیدا ہو رہے تھے وہ آبادی کے لحاظ سے بہت کم تھی (یہ خیال رکھنا چاہئے کہ تیسری دنیا میں آبادی نہایت تیز رفتاری سے بڑھ رہی تھی)۔ پھر یہ ہوا کہ چونکہ ان نئی صنعتوں نے روز مرہ کی استعمال کی چیزوں سے لگژری اشیاء کی ماس پروڈکشن (mass production) کرنا شروع کر دی، اس کے نتیجے پر چھوٹی اور پرانی صنعتوں میں کام کرنے والے اور دستکار، مثلاً لوہار، کمہار اور خاص طور پر کپڑوں کے کاریگر کروڑوں کی تعداد میں بے روزگار ہوئے۔

چنانچہ اس قسم کے ''ڈیولپمنٹ'' کا لب لباب یہ نکلا ہے کہ 1980ء کی دہائی کے ایک اندازے کے مطابق دنیا میں کوئی ایک بلین لوگ ایسے ہیں جو ایسے گرد و نواح میں زندگی بسر کرتے ہیں جو جانوروں کے رہنے کے لائق بھی نہیں، اور ہر روز تقریباً 80000 انسان بھوک سے یا زندگی کی دوسری بنیادی ضروریات سے محرومی کے باعث موت کے شکار ہو رہے ہیں!

پھر یہی نہیں، مغربی معاشی تھیوریوں اور وہ مقاصد جن کے مدنظر یہ تھیوریاں اور ٹیکنولوجی بنائی جا رہی ہے، اس نے دنیا کو کئی اور بحرانوں سے دوچار کر رکھا ہے۔ ایک بحران ہے۔ انرجی (توانائی) کا۔

مغربی ممالک کی غیر ضروری اور ویسٹ فل معیار زندگی کو برقرار رکھنے اور اس میں لگاتار اضافہ کرنے کی غرض سے انرجی کی جو لامحدود ضرورت ہے اس کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں کوئی سو ملین کوکا کولا کی بوتلیں یا ڈبے روزانہ پیئے جاتے ہیں۔ ان بوتلوں اور ڈبوں کو بنانے کے لئے ہر روز جتنی انرجی کی ضرورت ہوتی ہے وہ 22000 ٹن کوئلے کی انرجی کے برابر ہے۔ یہ انرجی اس سے بھی زیادہ ہے جتنی ملاوی جیسے ملک کو اپنی تمام ضروریات پوری کرنے کے لئے ہر روز درکار ہوتی ہے!

اسی طرح مغربی ممالک کی خوراک کی بے تحاشا ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دنیا بھر کی زراعت پر برا اثر ڈالا ہے۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے انٹینسیو فارمنگ یعنی شدید اور ماڈرن زراعتی طریقے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ اس طرح کی کھیتی باڑی کے نتیجے پر زرخیز مٹی بری طرح برباد ہو رہی ہے۔ مٹی کی بربادی سے سیلابوں کی بہتات ہوتی ہے ریگستانوں کا پھیلاؤ ہر جگہ بے تحاشہ بڑھ رہا ہے، جن کے باعث 1970 اور 1990ء کے درمیان تیسری دنیا کے ملکوں میں بھیانک قحط آئے ہیں اور دوسری طرف صنعتوں کے بے تحاشہ پھیلاؤ سے کرہ زمین

MashalBooks.com

کی انوائرنمنٹ اور ایکولوجی بری طرح برباد ہو رہی ہے۔

اور آخر میں اس بات پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ مغربی قسم کی ٹیکنولوجی اور صنعتوں کے لئے وسائل اور خاص کر انرجی کی لامحدود ضرورت کے باعث دنیا کے امن کو مستقل خطرہ لگا رہتا ہے اور یہ خطرہ اکثر سچ مچ کی جنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ عراق اور امریکہ کے درمیان حالیہ فوخناک جنگ کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے کہ مشرق واسطیٰ کی تیل کے ذخائر کو کون کنٹرول کرے گا۔

یہ ہیں وہ حقیقتیں جن کے باعث 1970ء کی دہائی میں ہی سوچنے سمجھنے والوں پر واضح ہو چکا تھا کہ ڈیویلپمنٹ کے لئے اور خاص کر تیسری دنیا کے ڈیویلپمنٹ کے لئے ایک نئی اپروچ اور ایک نئی سٹرٹیجی کی ضرورت ہے۔ ارنسٹ شوماخر نے تیسری دنیا کے لئے جس نئی سٹرٹیجی کا تصور دیا اس میں کلیدی کونسپٹ یہ تھا کہ غریب ملکوں کو اپنی غربت سے نجات حاصل کرنے کے لئے جس چیز کی فوری ضرورت ہے وہ پیداوار میں اضافے کی اتنی نہیں ہے جتنی اس بات کی ہے کہ روزگار کے مواقع میں اضافہ ہو۔ مغربی طرز کے ڈیویلپمنٹ کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز رہتی ہے کہ معاشی گروتھ ریٹ (growth rate) میں اضافہ ہوتا رہے اور اس گروتھ ریٹ کو مغربی معاشی ماہرین گروس نیشنل پروڈکٹ یا GNP سے ناپتے ہیں۔ اس معاشی تھیوری کے جو نتائج پیدا ہو رہے ہیں ان کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں۔ اس تھیوری کے خلاف شوماخر کا خیال تھا کہ (ہم یہاں اس کی تحریر سے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں)۔

''یہ بات اہم ہے کہ ہر فرد کچھ نہ کچھ پیداوار کرے، بجائے اس کہ گنتی کے صرف چند افراد میں سے ہر ایک بھاری تعداد میں پیداوار کرے، (اور اکثریت بے کار بیٹھی رہے)۔''

''سب سے پہلے اور سب سے اول ترجیح دینا چاہئے روزگار کے مواقع پیدا کرنے کو (لوگوں کو) روزگار میسر ہو تب ہی اور سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔ ایک بے کار شخص کی آوٹ پٹ صفر ہوتی ہے، جب کہ وہ شخص جو برسر کار ہو، اس کے کام کرنے کی اہلیت خواہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو، ایسا شخص (ملک کی معیشت) مثبت کونٹری بیوشن کرتا ہے.....'' اس کی وجہ یہ ہے کہ گو مشینوں کی جگہ افراد کے استعمال کرنے کی سٹرٹیجی کے باعث شروع شروع میں مجموعی گروتھ ریٹ سست پڑ سکتی ہے لیکن جلد ہی اس میں اضافہ ہونے لگے گا۔ شوماخر کے نزدیک اس یقین کی بنیاد یہ تھی۔

MashalBooks.com

''صرف اسی وقت جب کہ لوگ یہ اندازہ کرنے لگیں گے کہ ان کی محنت اور ان کا وقت کوئی قیمت رکھتا ہے (یعنی ان کو فائدہ پہنچاتا ہے) تب ہی ان کو یہ ترغیب ہوگی کہ وہ اس محنت اور وقت کی اور بھی قیمت بنائیں (یعنی اپنی پیداوار اور منافع میں اضافہ کریں)۔''

دوسرے الفاظ میں، جب تک انسانوں کو روزگار کے مواقع نہ ملیں اور انہیں اس بات کا ثبوت نہ ملے کہ ان مواقع کے ذریعے وہ اپنا معیار زندگی بلند کر سکتے ہیں، اس وقت تک ان کی دبی ہوئی پیداواری اور تخلیقی قوتیں اور صلاحیتیں نہیں ابھریں گی۔ ان قوتوں کو ریلیز کرنے کی پہلی شرط یہی ہے کہ ان کو کام ملے۔

لیکن تیسری دنیا میں عوام کو اتنے بڑے پیمانے پر روزگار کس طرح مہیا کیا جا سکتا ہے؟ شوماخر کے خیال میں یہ بات چند نہایت بنیادی اور انقلابی تبدیلیوں کے بغیر ناممکن تھی۔ اس نے جن تبدیلیوں کی نشان دہی کی وہ یہ ہیں:

(۱) ''کام کرنے کی جگہیں وہاں پیدا کی جائیں جہاں لوگ بستے ہیں، وہاں نہیں جہاں انہیں مائگریٹ کر کے جانا پڑتا ہے۔'' دوسرے الفاظ میں، ڈیویلپمنٹ کی کوششوں کا رخ شہروں سے موڑ کر دیہاتوں کی طرف کرنے کی ضرورت ہے۔ تیسری دنیا کی بے تحاشہ آبادی دیہاتوں میں بستی ہے۔ ایسا ڈیویلپمنٹ دیہاتوں کو نظر انداز کر کے کسی صورت میں سمجھ میں آنے والا نہیں۔ شہروں کو دیہاتوں پر ترجیح دینے کا مطلب ہے کہ ڈیویلپمنٹ انسانوں کی فلاح اور ترقی کے لئے نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ امیروں کے ایک مختصر طبقے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ اس قسم کے ڈیولپمنٹ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کی معیشت مسخ ہو جاتی ہے اور سماجی ظلم اور ناانصافیوں کی جڑیں گہری ہو جاتی ہیں۔''

(۲) کام کرنے کی یہ جگہیں ایسی ہوں جن پر خرچہ کم آئے تاکہ وہ بڑے پیمانے پر قائم کی جا سکیں اور جن کے لئے یہ ضروری نہ ہو کہ بھاری سرمایہ اکٹھا کیا جائے یا بیرونی ممالک سے سامان امپورٹ کیا جائے۔

(۳) جو پیداواری طریقے اختیار کئے جائیں وہ نسبتاً سادہ ہوں تاکہ ان میں اونچی سطح کی ہنرمندیوں کی زیادہ ضرورت نہ ہو۔ اور یہ اصول نہ صرف پیداواری پروسس کے لئے اپنایا جائے بلکہ اورگنائزیشن، خام مال کی سپلائی، فائنانسنگ (financing) مارکیٹنگ، غرض پیداوار اور کاروبار کے ہر شعبے میں اپنایا جائے۔

MashalBooks.com

(۴) جہاں تک ممکن ہو پیداوار اس قسم کی ہو کہ مقامی میٹیریل ہی استعمال کیا جائے اور پیداروار مقامی ضروریات ہی کو پورا کرنے کے لئے کی جائے۔

لیکن ان چار کاموں کو سرانجام دینے کے لئے دو حالات کا موجود ہونا لازمی ہے۔ یہ دو حالات ہیں۔

(ii) ڈی سنٹر لائزیشن (de centr alisaion) اور (ii) ''انٹرمیڈیٹ ٹیکنولوجی'' کا ڈیویلپمنٹ اور استعمال۔

(i) ڈی سنٹر لائزیشن سے شوماخر کا مقصد یہ ہے کہ حکومتیں ڈیویلپمنٹ کے لئے اپنی موجودہ سٹریٹجی ترک کر دیں جس کے تحت پوری قوم یا ملک کے لئے دارالحکومت میں ایک ہمہ گیر منصوبہ بنایا جاتا ہے۔ اس کی بجائے حکومتوں کو چاہئے کہ وہ ضلعی یا ریجنل اپروچ اختیار کریں جیسا کہ سوئزرلینڈ میں کامیابی سے اپنائی گئی ہے۔ ہر ضلع کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی ضروریات اور مخصوص حالات کے تحت اپنا ڈیویلپمنٹ پروگرام بنائیں یقیناً ڈیویلپمنٹ پروگام کا کچھ حصہ ایسا ہوگا جو پورے ملک کا احاطہ کرے گا اور جس کے لئے فیصلے مرکزی حکومت کو کرنا ہوں گے۔ لیکن شوماخر کا کہنا یہ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ڈیویلپمنٹ کے منصوبے بنانے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا کام ضلعوں یا اسی قسم کے چھوٹے انتظامی یونٹوں کے سپرد کر دینا چاہئے۔

شوماخر سکیم میں ضلع ایک ایسا انتظامی یونٹ ہے جس میں اندرونی کوہیژن (cohsion) ہو اور جس میں کم از کم ایک قصبہ یا ٹاؤن ہو جو ضلع کے مرکز کا کام کرے۔ اس کے علاوہ ضلع کے ہر گاؤں میں ایک پرائمری سکول، کم از کم چند مارکیٹ ٹاؤنز یا منڈیوں والے قصبوں میں سیکنڈری سکول ہوں اور ضلع کا مرکز اتنا بڑا ہونا چاہئے کہ وہ ایک اعلیٰ سطح کے تعلیمی ادارے کو چلا سکے۔

(ii) اگر ڈیویلپمنٹ کے لئے ریجنل اپروچ اختیار کرنا ہے تو اس کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ ایسی ٹیکنولوجی کو اختیار کیا جائے جو اس اپروچ کے لئے موزوں ہو یہاں اس بات پر زور دینا اہم ہے کہ موزوں ٹیکنولوجی سے مراد صرف یہ نہیں کہ وہ لیبر انٹینسیو ہو۔ دراصل شوماخر کے خیال میں کیپٹل انٹینسیو اور لیبر انٹینسیو صنعتوں کے درمیان جو امتیاز کیا جاتا ہے اصلی مسئلے کا اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ دونوں قسم کی صنعتوں کے حامیوں میں جو تصور پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ٹیکنولوجی کا فیصلہ ماہرین اوپر سے کرتے ہیں اور اس میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ شوماخر کے نزدیک یہی بات ساری غلطی کی جڑ ہے کون سی ٹیکنولوجی موزوں ہے اس کا فیصلہ ان لوگوں کو خود کرنا چاہئے جو

ڈیویلپمنٹ کے ایجنٹ ہیں (یعنی عوام) اور جن کے لئے ڈویلپمنٹ کیا جارہا ہے۔

نہ ہی موزوں ٹیکنولوجی کا تعلق سائز سے ہے۔ یہ بات سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ شوماخر کی کتاب کو ''چھوٹی چیز پیاری چیز'' (Small Isbeantiful) کا نام دیا گیا اور عام طور پر شوماخر کو ''چھوٹے پیمانے'' کی ٹیکنولوجی کے پیغمبر کی حیثیت سے شہرت ملی۔ خود شوماخر نے بھی ''انٹرمیڈیٹ ٹیکنولوجی'' کی اصطلاح استعمال کی۔ لیکن اس کے نزدیک ''انٹرمیڈیٹ'' کے معنی کچھ اور ہی تھے۔ شوماخر کا سروکار ''چھوٹے سائز'' سے نہیں تھا بلکہ اس بات سے تھا کہ ہر کام کرنے والی جگہ میں جو اکوپمنٹ استعمال ہورہا ہے اس پر کیا لاگت آتی ہے۔

موزوں ٹیکنولوجی کی لاگت پرانے طرز کی دیسی ٹیکنولوجی جو دیہاتوں اور تیسری دنیا میں دوسری جگہوں پر استعمال کی جاتی ہے اس سے زیادہ ہوگی، لیکن اس ٹیکنولوجی سے کہیں کم ہوگی جو مغربی طرز کی کیپٹل انٹینسیو ٹیکنولوجی پر آتی ہے۔ اسی اعتبار سے اس موزوں ٹیکنولوجی کی قوت پیداوار بھی ''انٹرمیڈیٹ'' ہوگی۔ یعنی روایتی پیداواری اوزاروں (مثلاً ہل) سے کہیں زیادہ، جدید ٹیکنولوجی (مثلاً ٹریکٹر) سے کہیں کم۔ لیکن اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس قسم کی ٹیکنولوجی ضلع کے عوام کی پہنچ سے باہر نہیں ہوگی۔ صرف مالی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ عام لوگوں کو جس قسم یا درجہ کی تعلیم میسر ہوتی ہے اور انہیں جس قسم کی ہنرمندیاں حاصل ہوتی ہیں ان کے اعتبار سے بھی یہ انٹرمیڈیٹ ٹیکنولوجی ایسی ہوگی جس کو وہ آسانی سے پاسکے گے اور اس میں اپنی ضروریات کے مطابق ردوبدل اور امپرومنٹ بھی کرسکے گے۔ اس طرح کی ٹیکنولوجی کو اختیار کرنے کا ایک اور نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ کام کی اور کاروبار کی اور گنائزیشن کنٹرول اور سپرویژن یہ سب بھی نسبتاً سادہ ہوگا جس پر کام کرنے والے خود حاوی ہوسکے گے۔

شوماخر کے مطابق تیسری دنیا میں ہنرمندوں اور کاروباری لوگوں کی کامیابی کا جو رونا رویا جاتا ہے وہ اس لئے ہے کہ ہمیشہ یہ کوشش کی جاتی ہے کہ سوفسٹی کیٹڈ ٹیکنولوجی کو ایسے سماجی انوائرنمنٹ پر لاکر ٹھونس دیا جائے جو نہایت سادہ ہے۔ انٹرمیڈیٹ ٹیکنولوجی کا فائدہ یہ ہوگا کہ چونکہ وہ زیادہ تر اسی انوائرنمنٹ اور اسی انوائرنمنٹ میں بسنے والوں کے ذریعہ پیدا ہوگی وہ اس انوائرنمنٹ کو دھچکا پہنچائے بغیر لوگوں کو پیداوار کے سٹیمٹک یعنی باقاعدہ اور ٹیکنکل طریقوں سے روشناس کرسکے گی اور ان کو اس قسم کے سائنٹفک طریقوں کا عادی بنا سکے گی جس کے باعث ان کی ہنرمندیوں میں بتدریج اضافہ ہوگا۔

MashalBooks.com

چنانچہ شوماخر نے جو موڈرن معاشی طریقوں اور ٹیکنولوجی پر تنقید کی اس سے اس کا مقصد دقیانوسی اور روایتی طریقوں کی مداح سرائی کرنا نہیں تھا، گو ان طریقوں میں سے بہت سے ایسے طریقے ہیں جو موڈرن ٹیکنولوجی پر سبقت رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ بتانا تھا کہ تیسری دنیا میں سائنسی پیداواری طریقوں اور سائنسی شعور کا فروغ اسی وقت ممکن ہے جب کہ تیسری دنیا کے عوام خود ان طریقوں کو اپنائیں، اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ سائنس اور ٹیکنولوجی ایسی چیز نہیں جو مالی یا تعلیمی اعتبار سے ان کی گرفت میں نہ آ سکے۔

اقبال خاں

MashalBooks.com

پیداوار کا مسئلہ

ہمارے عہد کا سب سے بڑا مغالطہ ہمارہ یہ عقیدہ ہے کہ ہم نے ''پیداوار کے مسئلے'' کو حل کرلیا ہے۔ یہ عقیدہ صرف ان لوگوں کا نہیں جو پیداواری مسائل سے بے خبر ہیں بلکہ تقریباً تمام ماہرین، مالکان صنعت، معلمان اقتصادیات اور دنیا بھر کی حکومتوں کے اقتصادی امور کے مشیروں کا یہی عقیدہ ہے۔ ان سب میں بہتیرے مسئلوں پر اختلافات ہوسکتے ہیں مگر سب اس بات پر متفق ہیں کہ پیداوار کا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔ ان کی نظر میں اب کام محض یہ رہ گیا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں فراغت کے اوقات گزارنے کی تعلیم عام کی جائے اور ترقی پذیر ممالک کو ٹیکنالوجی فراہم کی جائے۔

یہ سمجھا جاتا ہے کہ حالات کی خرابی کی ذمہ دار انسان کی فطری بدی ہے لہٰذا اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک ایسا مکمل سیاسی نظام تشکیل دیا جائے جو انسانی بدی کو جڑ سے اکھاڑ دے، اور ہر انسان کو نیکیوں کی طرف مائل کرے۔ یہ تصور اس عقیدے کا نتیجہ ہے کہ انسان نیک پیدا ہوتا ہے اور اگر وہ مجرم یا استحصال کرنے والا بن جاتا ہے تو یہ نظام کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ بلاشبہ ''نظام'' میں بہت سی خرابیاں ہیں اور انہیں دور کرنا ضروری ہے۔ اپنی خامیوں کے باوجود اگر یہ ''نظام'' اب بھی چل رہا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ''پیداوار کا مسئلہ'' حل ہو چکا ہے۔ چونکہ یہ غلط تصور موجودہ عہد کے تمام نظاموں'' میں قائم ہے لہٰذا اُن کے درمیان کسی ایک کے انتخاب سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔

یہ عام مغالطہ، جس کی جڑیں مضبوطی سے قائم ہوچکی ہیں، پچھلے تین چار سو برس میں فطرت کے ساتھ انسانی روابط کے متعلق فلسفیانہ زاویۂ نظر کی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ کہنا تو یہ چاہیے کہ فطرت کی جانب مغربی انسان کا رویہ تبدیل ہوا ہے لیکن اب جب کہ ساری دنیا مغربی طرز زیست کو اپنا رہی ہے۔ یہ عمومی بیان حق بجانب معلوم ہوتا ہے۔ جدید انسان خود کو فطرت کا ایک حصہ نہیں سمجھتا۔ اس کے برعکس اس کا خیال ہے کہ وہ باہر کی ایک خارجی قوت ہے اور تسخیر فطرت اس کا مقدر ہے۔ بعض تو فطرت کے ساتھ جنگ آزمائی کی بات بھی کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر وہ جیت بھی گئے تو بھی ہارے ہوؤں میں ہی ہوں گے۔ کچھ عرصہ پہلے

تک یہ جنگ کامیابی سے لڑی جارہی تھی اور انسانوں کے لامحدود قوتوں کے حامل ہونے کا مغالطہ بھی کافی عرصے تک جاری رہا لیکن مکمل فتح کی صورت واضح نہ ہوسکی۔

تاہم اب یہ صورت واضح ہوگئی ہے اور بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ انسانی زندگی کی بقا کے لیے اس جنگ کے کیا معنی ہیں۔

حیرت انگیز سائنسی اور تکنیکی کامیابیوں سے حاصل شدہ لامحدود انسانی قوتوں کے واہمے کا نتیجہ یہ مغالطہ بھی ہے کہ اب پیداواری مسئلہ حل ہوگیا ہے۔ یہ مغالطہ سرمائے اور آمدنی کے درمیان امتیاز قائم نہ کرنے کے باعث پیدا ہوا حالانکہ یہ فرق کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اس فرق کو تمام ماہرین اور تاجر جانتے ہیں اور تمام اقتصادی امور میں بڑے محتاط انداز میں یہ تفریق روا رکھتے ہیں۔ البتہ صرف وہاں نہیں جہاں اس کی انتہائی ضرورت ہے۔ یعنی اُس سرمائے میں جس کا بدل کوئی نہیں اور جسے انسان نے خود نہیں بنایا محض پایا ہے اور جس کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ کوئی بھی تاجر کسی ایسی فرم کے بارے میں، جو اپنے سرمائے کو تیزی سے ختم کررہی ہو، یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے پیداواری مسائل حل کرلیے ہیں اور اب مستحکم ہے اب اگر معاملہ ایک بہت بڑی فرم یعنی اس خلائی جہاز کی معیشت سے متعلق ہو جسے ہم زمین کہتے ہیں اور بالخصوص اس کے امیر مسافروں کی معیشت سے تو ہم اس بنیادی حقیقت سے کیسے انکار کرسکتے ہیں۔

اس اہم حقیقت سے گریز کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم حقائق سے دور ہوگئے ہیں اور ہر اس چیز کو، جو ہم نے خود نہیں بنائی، قدر کا حامل تصور نہیں کرتے یہاں تک کہ عظیم ڈاکٹر مارکس نے بھی جب ''قدر کے متعلق محنت کا نظریہ'' پیش کیا تو یہی تباہ کن غلطی کی۔ آج ہم نے اپنی محنت سے وہ سرمایہ اکٹھا کرلیا ہے جس کی مدد سے ہم نے سائنسی، تکنیکی اور دیگر علوم کا ذخیرہ، ایک تفصیلی مادی بالائی ڈھانچہ، لاتعداد اقسام کے اعلیٰ ساز وسامان وغیرہ پیدا کرلیے ہیں تاہم یہ سب اس عظیم سرمائے کا محض ایک معمولی سا حصہ ہیں جسے ہم آج استعمال کررہے ہیں۔ سرمائے کا ایک بہت بڑا حصہ انسان نہیں فطرت کا عطیہ ہے اور ہم اسے تسلیم بھی نہیں کرتے۔ اسے آج ہم خطرناک حد تک تیزی کے ساتھ استعمال کرتے جارہے ہیں اور اسی لیے اس بات پر یقین کرنا اور اس یقین کے مطابق عمل کرنا نہایت احمقانہ اور ہلاکت انگیز ہے کہ پیداوار کا مسئلہ حل ہوچکا ہے۔

آیئے اس ''فطری سرمائے'' پر غائر نظر ڈالیں۔ سب سے پہلے اور واضح طور پر معدنی ایندھن سامنے آتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی شخص بھی اس بات سے منکر نہیں ہوسکتا ہے کہ ہم

اسے آمدن کے طور پر استعمال کر رہے ہیں جب کہ وہ بلا شبہ ''سرمایہ'' ہے۔ اگر ہم اسے سرمایہ سمجھیں تو اسے بچانے کی فکر کریں گے۔ ہم ہر ممکن کوشش اس بات کی کریں گے کہ موجودہ استعمال کی مقدار میں کمی کریں۔ مثال کے طور پر ہم یہ سوچیں گے کہ اس سے حاصل شدہ رقم کو پیداوار کے وسائل اور طریق کار کے لیے اور ایسے طریق زندگی کے لیے استعمال کریں جس کا انحصار یا معدنی ایندھن پر بالکل نہ ہو یا اگر ہو بھی تو بہت کم۔ اگر ہم معدنی ایندھن کو سرمایہ سمجھیں نہ کہ آمدن تو ہم اس طرح کی اور بہت سی باتیں سوچیں گے اور عمل میں لائیں گے۔ آج ہم انہیں محفوظ کرنے کے حق میں نہیں اور ان کا استعمال کم کرنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ کر رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہم ان امکانات کا مطالعہ کریں جن سے نئے وسائل پیداوار اور زندگی کے نئے سانچے پیدا ہو سکتے ہیں تا کہ اُس ناگہانی حادثے سے بچ سکیں جس کی جانب ہم تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ہم انتہائی مسرت کے عالم میں اس لامحدود ترقی کی بات کرتے ہیں جو لکیر کے فقیر بن کر اب تک ہم نے کی ہے یا پھر امیر ملکوں کے لیے فراغت کے وقت کو صرف کرنے کی تعلیم اور غریب ممالک کو صنعت منتقل کرنے کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

اس فطری سرمائے کا استعمال اتنی تیزی سے ہو رہا ہے کہ سب سے امیر ملک امریکہ میں بہت سے لوگ یہ تقاضا کرنے لگے ہیں کہ بڑے پیمانے پر کوئلے کو پٹرول اور گیس میں تبدیل کر دیا جائے اور زمین کی دولت کی تلاش اور اس کا استعمال زیادہ بڑے پیمانے پر کیا جائے۔ اب یہ اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ ۲۰۰۰ء میں معدنی ایندھن کی کھپت کیا ہوگی۔ جنگ عظیم دوم سے اب تک یہ کھپت تگنی ہو چکی ہے اور ۲۰۸۲ء تک حالیہ کھپت تگنی ہو جائے گی۔ سوال یہ ہے: کیا یہ ہو سکتا ہے؟ اور جب یہ ہے: اسے ہونا چاہیے اس لیے یقیناً ہوگا۔ تاہم اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ ہم سرمائے کی کھپت کر رہے ہیں آمدن کی نہیں تو ایسے تمام سوال جواب بے معنی ہو جائیں گے۔ معدنی ایندھن انسانوں نے نہیں بنائے۔ انہیں دوبارہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ایک بار ختم ہو گئے تو بس ہو گئے۔

اگر ہم معدنی ایندھن کو بے دریغ خرچ کر دیں تو انسانی تمدن خطرے میں پڑ جائے گا۔ لیکن اگر اس سرمائے کو، جس کی نمائندگی فطرت کرتی ہے، برباد کر دیں تو خود زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لوگوں کو خطرے کا احساس ہو رہا ہے اور وہ فضائی آلودگی کو روکنے کا تقاضا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نزدیک فضائی آلودگی ایک ایسی برائی ہے جس کے ذمے دار لاپروا لالچی لوگ ہیں جو اپنے کوڑے کرکٹ کو پڑوسی کے باغ میں پھینک دیتے ہیں۔ زیادہ متمدن طریق کار

میں بے شک تھوڑا بہت فالتو خرچ بڑھ جائے گا اور اس کے لیے ہمیں اقتصادی ترقی کو بھی تیز کرنا ہوگا تا کہ اس خرچ کو پورا کیا جا سکے۔ بڑھتی ہوئی پیداوار کے حاصل کو محض کھپت کے لئے مختص کرنے کے بجائے کچھ نہ کچھ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے بھی لگانا ہوگا۔ یہ بڑی اچھی باتیں ہیں مگر یہ محض مسئلہ کی بالائی سطحوں کو ہی متاثر کریں گی۔

اب ذرا یہ غور کیجئے کہ ایسی اصطلاحیں مثلاً آلودگی، ماحول، ''اکولوجی'' (پودوں کا فضا سے تعلق) وغیرہ یکا یک کیسے اہمیت اختیار کر گئیں؟ صنعتی نظام تو ایک مدت سے قائم ہے لیکن دس پندرہ برس پہلے یہ الفاظ رائج ہی نہ تھے۔

اس کی وضاحت آسان ہے۔ معدنی ایندھن کی طرح ہم زندہ فطرت کے سرمائے پر زندگی گزارتے رہے ہیں۔ تاہم یہ خرچ معتدل تھا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد سے ہم نے اس سرمائے کو خرچ کرنے کی رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی ہے۔ جنگ عظیم دوم تک اور جنگ کے دورانیے کی ہماری صنعتی کارگزاریاں آج کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں اور آئندہ چند سالوں میں ہماری صنعتی پیداوار ۱۹۷۵ء تک کی ساری دنیا کی صنعتی پیداوار سے بھی بڑھ جائے گی۔

صنعتی پیداوار میں اتنی بڑی مقداری چھلانگ کے ساتھ ساتھ معیاری چھلانگ بھی لگائی گئی ہے۔ ہمارے سائنسدانوں اور صنعتی ماہرین نے ایسے ایسے مرکبات بنائے ہیں جن کا فطرت میں بھی کوئی وجود نہیں۔ تقریباً بیس برس کی مدت میں یہ بہت بڑی مقدار میں ظاہر ہوئے ہیں۔ فطرت میں ان کی مخالفت کی قوت نہیں اس لیے یہ جمع ہوتے جا رہے ہیں اور ایک طویل مدت تک ان کا جمع رہنا بہت سی صورتوں میں بیحد خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور بعض دوسری صورتوں میں اس کے اثرات کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔

بہ الفاظ دیگر پچھلے پچیس برسوں میں صنعتی پیداوار میں مقدار اور معیاری تبدیلیوں نے ایک نئی صورت حال پیدا کر دی ہے جسے ہماری مسلسل صنعتی کامیابیوں نے پیدا کیا ہے۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ ہم یہ بھی نہ سمجھ پائے کہ فطرت کے اس سرمایے کو، جس کا نعم البدل کوئی نہیں، ہم بیدردی سے خرچ کرتے جا رہے ہیں اور اس سے تجاوز کر گئے ہیں جو مہربان فطرت نے مقرر کر رکھی تھی۔

اب ''آمدن ایندھن'' (Income Fuel) کی طرف آیئے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ دنیا کا صنعتی نظام آنے والے زمانے میں پانی اور ہوا کی مدد سے چلے گا۔ ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ ہم تیزی

سے ایٹمی توانائی کے عہد میں داخل ہو رہے ہیں تاہم انسانوں کی توانائی کی ضرورتوں میں اس نئی ایٹمی توانائی کا حصہ ابھی بہت کم ہے۔

یہ تجویز کہ ہر سال کروڑوں ٹن معدنی ایندھن کو صرف کرنے کے بجائے ایٹمی توانائی سے اس ضرورت کو پورا کیا جائے، ایندھن کے مسئلے کو یوں تو حل کر دے گی مگر ماحول اور فضا کے مسائل بڑی خوفناک صورت اختیار کر لیں گے۔ یوں ہم ایک مسئلے کو اس طرح حل کریں گے کہ اس سے بڑا دوسرا مسئلہ دوسرے حدود میں پیدا کر دیں گے۔

اب ہم ''فطری سرمائے'' کی ایک تیسری قسم ''انسان کے فطری جوہر'' کی طرف آتے ہیں جسے ہم بطور آمدنی ختم کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگوں پر یہ بات ابھی واضح نہیں ہے۔ وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا آج ہمیں بہتر غذا، بہتر کپڑے، بہتر مکانات اور بہتر تعلیم میسر نہیں؟ لیکن جوہر سے ہماری یہ مراد نہیں ہے۔ انسان کے فطری جوہر کا اندازہ قومی پیداوار کی شماریات سے نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کا اندازہ نقصان کی علامتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ان علامتوں مثلاً جرائم، منشیات کے استعمال، ذہنی تشنج، باغیانہ رجحانات، اقدارِ حیات کی بربادی وغیرہ کے اعداد و شمار کا بیان مقصود نہیں ہے۔ شماریات سے کسی چیز کو بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

ہم یہاں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آج ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے کہ ہم کسی طرح تباہی کے راستے سے ہٹ جائیں۔ ہم میں سے ہر شخص اس مسئلے سے نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ مستقبل کے بارے میں گفتگو اسی وقت مفید ہو سکتی ہے کہ ہمارا عمل وقت کے اسی حالیہ لمحے سے شروع ہو جائے اور جب تک ہم ''سب کچھ بہترین ہے'' کہتے رہیں گے، کچھ نہیں کر سکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک نیا اسلوبِ حیات پیدا کریں اور اس کے ساتھ پیداوار اور اس کی کھپت کا نیا نظام بھی۔ ایسا اسلوبِ حیات جسے ہم مستقلاً برقرار رکھ سکیں۔ اس سلسلے میں ہمیں تین بنیادی کام کرنے ہیں: زراعت اور باغبانی میں ہم ایسے بہتر طریقے استعمال کر سکتے ہیں جو حیاتیاتی اعتبار سے مناسب ہوں۔ مثلاً زمین کو زیادہ سے زیادہ زرخیز بنا کر ہم صحت، حسن اور استحکام حاصل کر سکتے ہیں۔ پیداوار اس کا لازمی نتیجہ ہوگی۔ صنعت کے شعبے میں ہم چھوٹے پیمانے کی ٹیکنالوجی سے کام لے سکتے ہیں، ایسی ٹیکنالوجی جو نسبتاً کم ضرر رساں ہو اور جو انسانی رُخ رکھتی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ کام دلچسپی سے کریں اور اس میں خوشی محسوس کریں، بجائے اس کے کہ وہ کام محض تنخواہ کے لیے کریں گے اور خوشیوں کے حصول کو آئندہ فراغت کے وقت کے لیے اُٹھا رکھیں۔ چونکہ

انڈسٹری جدید زندگی کے لیے لازمی چیز ہے اُس لیے اس میں ہمیں انتظامیہ اور کارکنوں کے درمیان حصہ داری کے نئے طریقوں پر غور کرنا ہوگا اور ایسے طریقے بھی ڈھونڈنے ہوں گے جن میں سب برابر کے حصے دار ہوں۔

ابھی ہمیں یہ سیکھنا ہے کہ ہم صلح و آشتی کے ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں، محض اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ فطرت کے ساتھ بھی اور سب سے بڑھ کر ان بڑی طاقتوں کے ساتھ جنہوں نے ہمیں اور فطرت دونوں کو پیدا کیا ہے۔ ہم یقینی طور محض اتفاقات کا نتیجہ نہیں ہیں اور اس سے بڑھ کر یقینی بات یہ ہے کہ ہم نے خود کو پیدا نہیں کیا ہے۔ اس باب میں ہم نے جن خیالات کو جستہ جستہ پیش کیا ہے ان کی تفصیل اگلے ابواب میں آئے گی۔ کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو آسانی سے یہ بات تسلیم کرلیں کہ انسان کے مستقبل کو جو خطرات اس وقت لاحق ہیں انہیں محض چند سطحی ترمیموں سے دور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کہ محض سیاسی نظام کی تبدیلی سے یہ بات ممکن نہ ہوگی۔

اگلے ابواب میں ہم پوری صورت حال پر امن و استحکام کے زاویے سے نظر ڈالیں گے۔ آج انسان کے پاس خود کو تباہ کرنے کے جو وسائل موجود ہیں ان کے پیش نظر امن و آشتی کا مسئلہ اتنا اہم ہوگیا ہے جتنا پوری انسانی تاریخ میں پہلے کبھی نہ تھا۔ اور معاشی زندگی کے استحکام کے بغیر ہم امن کی عمارت کیسے اُٹھا سکتے ہیں؟

MashalBooks.com

امن واستحکام

جدید دنیا کا اس بات پر ایمان ہے کہ امن وآشتی کی صحیح بنیاد دنیا بھر کی خوشحالی پر ہی رکھی جاسکتی ہے۔ تاریخ سے تو یہ شہادت نہیں ملتی کہ امیر لوگ غریبوں کے مقابلے میں ہمیشہ زیادہ پُر امن رہے ہوں۔ اس کے باوجود یہ نقطہ اُٹھایا جاسکتا ہے کہ امیروں نے غریبوں کی جانب سے خود کو کبھی محفوظ نہیں سمجھا۔ امیروں کا تشدد اسی خوف کا نتیجہ رہا ہے۔ یوں اگر سبھی خوشحال ہو جائیں تو صورتِ حال بالکل مختلف ہوگی۔ امیر آدمی بھلا جنگ کیوں کرے گا؟ اس میں اس کا کیا فائدہ ہے؟ البتہ غریب یہ کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے پاس غربت کی زنجیروں کے سوا کھونے کو کچھ نہیں ہے۔ اس لئے امن کے قیام کے لیے خوش حالی ضروری ہے۔

خوشحالی کے اس تقاضے میں بڑی کشش ہے۔ جتنی جلدی ایک چیز حاصل ہوگی اتنی ہی جلدی دوسری کا حصول ممکن ہوگا۔ اس میں یہ کشش بھی ہے کہ اس طرح ہم بہت سے اخلاقی تقاضوں سے بچ جائیں گے۔ اور خواہشات کی نفی اور قربانی کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ اس کے برعکس سائنس اور صنعت کے ذریعے ہم امن اور خوشحالی حاصل کر سکتے ہیں۔ غریبوں کے لیے یہ مشورہ ہے کہ وہ بے صبری میں اس مرغی کو ہی ذبح نہ کر دیں جو کبھی نہ کبھی ان کے لیے بھی سونے کے انڈے دے سکتی ہے۔ امیروں کو یہ صلاح ہے کہ وہ نہایت عقلمندی سے غریبوں کی مدد کرتے رہیں کہ ان کے لیے امیر تر بننے کا یہی طریقہ ہے۔

۱۹۳۰ء کے معاشی بحران کے دوران میں لارڈ کینز نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب ہر شخص خوشحال ہو جائے گا اور اس وقت ہم ''ایک بار پھر ذریعے پر مقصد کو اور منفعت پر خیر کو ترجیح دیں گے۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ تنبیہ بھی کہ ''ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے۔ کم از کم اگلے سو برس تک ہمیں خود اور دوسروں کو یہی باور کرانا ہے کہ خیر میں بدی اور بدی میں خیر ہے۔ اس لیے کہ بدی میں منفعت ہے اور خیر میں نہیں ہے۔ حرص، سود اور احتیاط ابھی کچھ مدت تک ہمارے اوتار بنے رہنے چاہیں کیونکہ یہی ہمیں معاشی احتیاج کے غار سے نکال کر دن کی روشنی میں لے جاسکتے ہیں''۔ ملاحظہ فرمایئے کینز کا پیغام کتنا واضح ہے۔ ان کے نزدیک اخلاقی تصورات محض فضول ہی نہیں وہ دراصل رکاوٹ بھی ہیں کہ ''بدی میں منفعت ہے اور خیر میں نہیں

ہے۔''یوں جنت کی راہ بدطینتی سے ہموار کی گئی ہے!

اب ہم اس مفروضے پر روشنی ڈالیں گے۔اس کے تین پہلو ہیں:(۱) ساری دنیا کی خوشحالی ممکن ہے۔(۲)اس کا حصول ''خود کو خوشحال بناؤ'' کے مادی فلسفے کی بنیاد پر ممکن ہے۔ (۳) یہ کہ یہی امن وآشتی کی راہ ہے۔

آیئے ہم دنیا کے پیداواری ذرائع کی بڑھتی ہوئی مانگ پر غور کریں جو محض اس لیے بڑھ رہی ہے کہ ہر شخص ''زیادہ'' کے حصول کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ چونکہ ہم تمام پیداواری ذرائع کی ہر نوع پر غور نہیں کر سکتے اس لیے محض ایک نوع کو لے لیجیے جسے کسی قدر مرکزی حیثیت حاصل ہے اور وہ ہے ایندھن۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ زیادہ سے زیادہ خوشحالی کا مطلب معدنی ایندھن کی زیادہ سے زیادہ کھپت ہے۔فی الحال دنیا کے امیر اور غریب ممالک میں خوشحالی کا تفاوت بہت زیادہ ہے اور یہ بات ان ممالک کی ایندھن کی کھپت کے تخمینے سے بھی واضح ہوتی ہے۔امیر ممالک میں ایندھن کی کھپت غریب ممالک کی نسبت چودہ گنا زیادہ ہے اور اگر غریب ممالک بھی اتنا ہی ایندھن استعمال کرنے لگیں جتنا امیر ممالک میں ہوتا ہے تو دنیا بھر میں ایندھن کی کھپت آج کے مقابلے میں تین گنا بڑھ جائے گی۔

یہ بات تو واضح ہے کہ امیر ممالک اس وقت دنیا بھر کے سستے اور آسانی سے حاصل ہونے والے معدنی ایندھن کو زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے دنیا کو اس قدرتی عطیے سے محروم کر رہے ہیں۔ان کی مسلسل معاشی ترقی ان قدرتی وسائل سے مبالغہ آمیز تقاضے کر رہی ہے۔اس کا نتیجہ بالآخر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے پہلے کہ غریب ممالک اتنی دولت، تعلیم، صنعتی صلاحیت اور کثیر سرمایہ کسی متبادل ایندھن کو استعمال کرنے کے لیے حاصل کر سکیں اس وقت تک موجودہ معدنی ایندھن مہنگا اور کمیاب ہو جائے۔

معدنی ایندھن کے ذخائر کی تقسیم قدرت نے غیر مساویانہ طور پر کی ہے اور کسی وقت بھی اس کی رسد میں کمی، خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، دنیا کے نرالے خطوط پر امیر وغریب میں تقسیم کر دے گی۔خصوصی طور پر پرکشش علاقے، مثلاً مشرق واسطیٰ اور افریقہ، اتنے بڑے پیمانے پر رشک وحسد کا مرکز بن جائیں گے جس کا ہم آج اندازہ نہیں لگا سکتے۔زیادہ کھپت والے علاقے، مثلاً مغربی یورپ اور جاپان، ایک دوسرے کے مقابل ہوں گے اور اس طرح ٹکراؤ کی صورت

پیدا ہو جائے گی۔

ایسا ممکن ہے کہ ہم کسی خوفناک مسئلے کو یہ کہہ کر ٹال جائیں کہ بہتری کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو ہی جائے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تیل، گیس یا کوئلے کے اتنے بڑے ذخائر دریافت ہو جائیں جن کے بارے میں کسی کو گمان بھی نہ ہو۔ اور ہاں، ایٹمی توانائی بھی تو ہے جسے ایک چوتھائی یا ایک تہائی ضرورتوں کے پورا کرنے تک کیوں محدود رکھا جائے؟ اس طرح مسئلے کو کسی دوسری سطح پر سرکایا تو جا سکتا ہے مگر اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ معدنی ایندھن کا اتنے بڑے پیمانے پر استعمال (اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ اس کی رسد میں کبھی کوئی کمی نہ ہوگی) فضائی آلودگی کے ایسے خطرات کو جنم دے گا جس کی ماضی میں کوئی نظیر نہ ملے گی۔

اب ایٹمی توانائی کو لیجیے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں یورانیم کی مقدار اتنی نہیں کہ وہ ایٹمی توانائی کے کسی بڑے پروگرام کے لیے پوری ہو سکے۔ یعنی اتنے بڑے پروگرام کے لیے جو ساری دنیا کے معدنی ایندھن کے مسئلے پر کوئی واضح اثر ڈال سکے لیکن فرض کیجیے کہ یہ لوگ غلط کہتے ہیں۔ یورانیم کی کافی مقدار دریافت ہو جائے گی۔ دنیا جہان سے اکٹھا کر کے اسے آبادی کے مرکزی حصوں میں پہنچایا جائے گا جہاں اسے انتہائی حد تک تابکار بنایا جائے گا۔ ایسی صورت میں اس سیاسی خطرے سے قطع نظر کہ کوئی شخص اس خوفناک مواد کے ذرا سے ٹکڑے کو ایسے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے جو امن کے منافی ہو اس عظیم خطرے کا تو اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا جو زندگی کو لاحق ہو جائے گا۔ دوسری طرف اگر معدنی ایندھن کے ذخائر اتنی بڑی تعداد میں دریافت ہو جائیں تو آلودگی کے مسائل اتنے بڑے پیمانے پر پیدا ہو جائیں گے کہ ان کی کوئی مثال ماضی میں نہیں ملے گی۔

اب ایٹمی توانائی کو لیجیے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں یورانیم کی مقدار اتنی نہیں کہ وہ ایٹمی توانائی کے کسی بڑے پروگرام کے لیے پوری ہو سکے۔ یعنی اتنے بڑے پروگرام کے لیے جو ساری دنیا کے معدنی ایندھن کے مسئلے پر کوئی واضح اثر ڈال سکے لیکن فرض کیجیے کہ یہ لوگ غلط کہتے ہیں۔ یورنیم کی کافی مقدار دریافت ہو جائے گی۔ دنیا جہاں سے اکٹھا کر کے اسے آبادی کے مرکزی حصوں میں پہنچایا جائے گا جہاں اسے انتہائی حد تک تابکار بنایا جائے گا۔ ایسی صورت میں اس سیاسی خطرے سے قطع نظر کہ کوئی شخص اس خوفناک مواد کے ذرا سے ٹکڑے کو ایسے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے جو امن کے منافی ہو اس عظیم خطرے کا تو اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا جو

زندگی کو لاحق ہو جائے گا۔ دوسری طرف اگر معدنی ایندھن کے ذخائر اتنی بڑی تعداد میں دریافت ہو جائیں تو آلودگی کے مسائل اتنے بڑے پیمانے پر پیدا ہو جائیں گے کہ ان کی کوئی مثال ماضی میں نہیں ملے گی۔

میں نے ایندھن کی مثال اس لیے لی ہے کہ اس حوالے سے میں اپنی بات کی وضاحت کرسکوں اور وہ یہ کہ ایسی معاشی ترقی، جو اقتصادیات، طبیعات، کیمیا اور صنعت کے نقطہ نظر سے کسی واضح حد بندی کی قائل نہیں، ماحول کی سائنسوں کے نقطہ نظر سے یقیناً تباہ کن نتائج پیدا کرے گی۔ زندگی کے متعلق ایسا رویہ، جس کا مقصد یکسوئی سے دولت حاصل کرنا ہو یعنی مادیت پسندی، اس دنیا سے مطابقت نہیں رکھتا، اس لیے کہ یہ حدود کا پابند نہیں جبکہ ماحول، جس میں یہ رویہ اپنایا جا رہا ہے، حد درجہ محدود ہے۔ ہمارا ماحول اب بھی ہمیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہے کہ بعض دباؤ حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ جب کبھی ایک مسئلہ حل ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں دس حل طلب مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ پروفیسر یری کا منر کا خیال ہے: مسائل ہماری اتفاقی ناکامیوں کا نتیجہ نہیں بلکہ صنعتی کامیابیوں کا حاصل ہیں۔

بعض حضرات اپنی رجائی نقطہ نظر کے مطابق یہ کہیں گے کہ ''سائنس کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لے گی''۔ بے شک، بشرطیکہ سائنسی کوششوں میں کسی بنیادی تبدیلی اور سمت کا تعین ہو جائے۔ پچھلے سو برسوں میں سائنس اور صنعتوں کے فروغ کے باعث منفعت سے کہیں زیادہ تیزی سے خطرات پیدا ہوئے۔

غیر محدود پیمانے پر ایسی معاشی ترقی کا تصور کہ ہر شخص دولت مند ہو جائے کم از کم دو نکات کی بنا پر رکھا جا سکتا ہے: بنیادی ذرائع کا حصول اور ماحول کی مداخلت کو سہارنے کی سکت۔ اس معاملے کا طبعی اور مادی پہلو محض یہی ہے۔ اب ہم بعض غیر مادی پہلوؤں پر توجہ دیں گے۔

بلاشبہ ذاتی منفعت کا تصور انسانی فطرت کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے۔ لارڈ کنیر کا خیال ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ''ہم مذہب اور روایتی اقدار کے ان پختہ اصولوں کی طرف لوٹیں جن کے مطابق حرص ایک بدی ہے، سود لینا فعلِ قبیح ہے اور دولت سے محبت مکروہ ہے۔''

اُن کے مشورے کے مطابق معاشی ترقی محض اس صورت میں ممکن ہے جب ہم انسانی خودغرضی کے ان طاقتور محرکات کا استعمال نہ کریں جن سے دنیا بھر کے مذاہب اور روایتی حکمت ہمیں روکتی ہے۔ جدید معاشی نظام کے کل پُرزے وحشت ناک لالچ اور دہشت خیز حسد کا نتیجہ

ہیں اور یہی اس کے فروغ کا باعث ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے اسباب کتنے عرصے تک مؤثر رہ سکتے ہیں یا ان میں تباہی کے عناصر بھی شامل ہیں۔ اگر کنیز کا یہ خیال ہے کہ ''بدی میں منفعت ہے اور خیر میں نہیں ہے'' تو یہ محض امر واقعہ کا بیان ہے جو صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی یا پھر یہ ہوسکتا ہے کہ تھوڑی مدت کے لیے تو یہ صحیح معلوم ہو مگر لمبے عرصے میں غلط ثابت ہو۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟

میرا خیال ہے اب اتنی وافر شہادت موجود ہے کہ ہم یہ ثابت کرسکیں کہ یہ بیان بعینہ اور عملی مفہوم میں غلط ہے۔ اگر ایسی انسانی بدی مثلاً حرص اور حسد کو منظم طور پر پیدا کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ عقل کی بربادی ہوگا۔ وہ شخص جو حرص اور حسد سے تحریک پاتا ہے اشیا کو اپنی اصل صورت میں دیکھنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ وہ انہیں اپنی وحدت میں اور مکمل طور پر دیکھ ہی نہیں سکتا اور یوں اس کی کامیابیاں بھی ناکامیوں بھی بدل جاتی ہیں۔ اگر پورے کے پورے معاشرے ہی ان برائیوں کے شکار ہو جائیں تو شاید وہ بڑی بڑی کامیابیاں تو حاصل کرلیں مگر روزمرہ کے بنیادی انسانی مسائل حل کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ مجموعی قومی پیداوار، ماہرین شماریات کے مطابق تیزی سے بڑھ سکتی ہے، حالانکہ عام آدمی کو اس کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا اور وہ خود کو بڑھتے ہوئے آشوب، عدم تحفظ اور اجنبیت کا شکار پاتا ہے۔ تھوڑی ہی مدت بعد مجموعی قومی پیداوار بھی بڑھنے سے انکار کردیتی ہے اور اس کا سبب سائنس اور صنعت کی خرابی نہیں بلکہ عدم تعاون کا فالج ہوتا ہے جس کا اظہار مختلف اقسام کی فراریت میں ہوتا ہے۔ یہ فراریت محض مظلوم اور استحصال زدہ طبقے میں نہیں ہوتی بلکہ اعلیٰ مقتدر طبقوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

کیا اس بات کا امکان اب بھی باقی ہے کہ آج کے بہت سے خوش حاصل معاشروں میں پائی جانے والی معاشرتی بیماریاں اچھی حکومتیں (بشرطیکہ مہیا ہوسکیں) محض سائنس اور صنعت کے زیادہ استعمال کے ذریعے یا قوانین کے بہتر استعمال سے دور کرسکتی ہیں؟ میرا خیال ہے کہ بین الاقوامی خوشحالی کی بنیاد پر عالمی امن قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ ایسی خوشحالی (جدید مفہوم میں) اگر حاصل بھی ہو جائے تو وہ انسانی فطرت کے ایسے محرکات مثلاً حرص اور حسد کا نتیجہ ہوگی جو بالآخر انسانی عقل کو، اس کی مسرتوں اور سکون کو اور اس طرح اس کی زندگی کے تحفظ اور امن و امان کو غارت کردے گی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ امیر غریبوں سے زیادہ امن کی قدر کرتے ہیں مگر اسی وقت جب انہیں مکمل تحفظ کا یقین ہو اور یہ بات اپنے اندر تضاد رکھتی ہے۔ امیروں کی دولت

فطرت کے عطیات سے زیادہ سے زیادہ تقاضے کرتی ہے اور یہی تقاضے اسے ٹکراؤ کی سمت لے جاتے ہیں غریبوں سے نہیں (جو کمزور اور غیر محفوظ ہوتے ہیں) بلکہ دوسرے امیر لوگوں سے۔

یہ تصور کہ ''بدی میں منفعت ہے اور خوبی میں نہیں ہے'' انسانی عقل کی نفی ہے۔ یہ توقع کہ نیکی اور خیر کو موقوف کر کے ہم پہلے عالمی خوشحالی حاصل کر لیں نیز یہ کہ روحانی اور اخلاقی اقدار سے قطع نظر کر کے ہم یکسوئی کے ساتھ دولت جمع کریں اور اس طرح اس سرزمین پر امن قائم کریں نہایت غیر حقیقت پسندانہ، غیر سائنسی اور غیر منطقی توقع ہے۔ اب جب کہ ہم معاشی، صنعتی اور سائنسی میدان میں انتہائی کامیابیاں حاصل کر چکے ہیں۔ روحانی اور اخلاقی اقدار کے مسئلے نے مرکزی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

آج ہمیں ایسی اقتصادیات کی ضرورت ہے جس کی بنیاد استقلال پر ہو۔ یہ سرزمین ہر شخص کی ضرورتوں کو تو پورا کر سکتی ہے مگر ہر شخص کی حرص کو ختم نہیں کر سکتی۔ اپنی ضرورتوں کو بڑھاتے رہنا عقل کی نفی ہے۔ یہ آزادی اور امن کی نفی بھی ہے۔ ضرورتوں کے بڑھنے کے ساتھ خارجی قوتوں پر ہمارا انحصار بڑھ جاتا ہے۔ ایسی قوتوں پر جو ہمارے تابع نہیں ہیں۔ یوں اپنا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ محض ضرورتوں کو کم کر کے ہم اُس کشائش سے چھٹکارا پا سکتے ہیں جو کشمکش اور جنگ کا بنیادی سبب ہوتی ہے۔

مستقل اقتصادیات (Economics of permanence) کا مفہوم یہ ہے کہ ہم سائنس اور صنعت کی ایسی نئی تفسیر پیش کریں کہ وہ انسانی عقل کے لیے اپنے دروازے کھول دے اور اپنے پورے ڈھانچے میں عقل کو سمو لے۔ ایسی سائنس اور صنعت ہمارے کام کی نہیں جو ماحول کو آلودہ کرے، معاشرتی ڈھانچے اور خود انسان کی تذلیل کرے خواہ اس سے کتنی ہی ذہانت کیوں نہ ٹپکتی ہو اور سطحی طور پر کتنی ہی دلآویز کیوں نہ ہو۔ بڑی بڑی مشینیں، جو اقتصادی قوت کا مرکز بن جاتی ہیں اور ماحول کو بڑے پیمانے پر آلودہ کرتی ہیں، ترقی کی دلیل نہیں ہیں۔ وہ عقل انسانی کا انکار ہیں۔ عقل، سائنس اور صنعت کی ایسی تفسیر چاہتی ہے جو نامیاتی مبنی بر خیر، غیر متشددانہ، لطیف اور حسین اشیا کو پیدا کر سکے۔ امن، جیسا کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے، غیر منقسم وحدت ہے۔ پھر ہم لاپروا سائنس اور تشدد پسند صنعت کی بنیاد پر امن کیسے قائم کر سکتے ہیں؟ ہمیں ایسے صنعتی انقلاب کی ضرورت ہے جو ہمیں ایسی ایجادات اور مشینیں مہیا کرے جو آج کے تباہ کن رویوں کو تبدیل کر دیں۔

MashalBooks.com

پھر ہم آج کے سائنس دانوں اور صنعت سازوں سے کیا چاہتے ہیں؟ میرا جواب یہ ہے کہ ہم ایسے آلات اور مشینیں چاہتے ہیں جو!

۱۔ سستی ہوں تا کہ تقریباً ہر شخص انہیں حاصل کر سکے۔

۲۔ چھوٹے پیمانے پر استعمال میں لائی جا سکیں۔

۳۔ انسانوں کے تخلیقی اظہار کی خواہش سے مطابقت رکھ سکیں۔

ان تین خصائص سے عدم تشدد پیدا ہوگا اور انسان اور فطرت کا ایسا تعلق پیدا ہوگا جسے مستقل طور پر قائم رکھا جا سکے گا۔ آیئے ہم ایک ایک کر کے ان پر نظر ڈالیں۔

ایلڈس ہکسلے کے خیال کے مطابق اگر آج ہمارے موجدین اور انجینئر حضرات عام لوگوں کو ایسے آلات مہیا کر دیں جن کی مدد سے وہ نفع بخش اور اہم کام سرانجام دے سکیں؛ مردوں اور عورتوں کو اس قابل بنا دیں کہ وہ اپنے آقاؤں سے نجات حاصل کر کے خود اپنے آجر بن جائیں یا کسی ایسے کوآپریٹو گروپ کے ممبر ہو جائیں جو اپنی ضرورتوں اور مقامی بازار میں فروخت کے لیے کچھ پیدا کرتا تو ایسی صنعتی ترقی، جس کے نصب العین مختلف ہوں گے، ایک طرف تو آہستہ آہستہ شہری آبادی میں کمی کا باعث ہوگی، قابل کاشت زمین زیادہ سے زیادہ حاصل ہو سکے گی، ہر شخص کو ذرائع پیداوار کی ملکیت حاصل ہوگی اور سیاسی اور اقتصادی اقتدار کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور دوسری طرف زیادہ لوگوں کے لیے انسانی سطح کی تسکین میسر ہوگی۔ یہی اصل اور حقیقی جمہوریت کی بنیاد ہوگئی اور اسی کی بدولت ہم بڑے پیمانے پر پیدا ہونے والی اشیائے استعمال کے بارے میں اس احمقانہ اور مضر ''تعلیم بالغاں'' کے اثرات سے بچ سکیں گے جو اشتہارات کے ذریعے ہمیں دی جاتی ہے۔

اگر آلات اور مشینیں اتنی سستی ہو جائیں کہ وہ بہ آسانی مہیا ہو سکیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ جس معاشرے میں استعمال کی جائیں گی اس کی آمدنی کی سطح سے مطابقت رکھیں گی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک چھوٹے سے کارخانے کو چلانے کے لیے جس قدر سرمائے کی ضرورت ہوگی وہ ایک حوصلہ مند کارکن کی سالانہ آمدنی کے برابر ہوگا۔ اگر سرمائے کی رقم بہت زیادہ ہو تو معاشرہ مشکلات کا شکار ہو جائے گا۔ مثلاً اس میں دولت اور اقتدار محض چند باحیثیت لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔ ایسے لوگوں کی تعداد بڑھے گی جو معاشرے سے مطابقت نہیں کر سکیں گے اور یوں معاشرتی زندگی کے لیے مستقل خطرہ بن جائیں گے۔ بے روزگاری

بڑھتی جائے گی، تقسیم آبادی متناسب نہ رہے گی اور شہر کی طرف بھاگنے کا رجحان بڑھتا جائے گا۔ معاشرتی آشوب، انفرادی بے تعلقی اور جرائم کی رفتار تیز ہو جائے گی۔

آلات اور مشینوں کے سلسلے میں ہمارا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر استعمال کے لائق ہوں۔ مشینوں کا چھوٹے پیمانے پر استعمال، خواہ وہ کتنا ہی زیادہ ہو، فطری ماحول کے لیے بڑے پیمانے پر استعمال کے مقابلے میں کم نقصان دہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی مشینوں کی قوت فطرت کی قوتوں کے مقابلے میں ہمیشہ کم ہوگی۔ انسانی علم کی کم مائیگی کے پیش نظر چھوٹے پیمانے کا انسانی عمل انسانی عقل پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی بنیاد مکمل تفہیم کے بجائے محض تجربے پر ہوتی ہے۔ جزوی علم کو بڑے پیمانے پر استعمال کر کے ہم ہمیشہ خطرات کو دعوت دیتے ہیں جیسا کہ آج ایٹمی توانائی کے استعمال، زراعت میں نئی کیمسٹری کے استعمال اور دیگر لاتعداد وسائل سے ظاہر ہے۔

یہ ممکن ہے کہ بسا اوقات محدود وسائل کے ساتھ کام کرنے والے اپنی کم فہمی کے باعث کوئی خطرناک صورت پیدا کر دیں لیکن اِس کی اُس تباہی کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہ ہوگی جو بڑے پیمانے پر کام کرنے والے اپنی حرص، رشک و حسد اور خواہش اقتدار کی بنا پر لائیں گے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ چھوٹے پیمانے پر کام کرنے والے لوگ اپنے چھوٹے سے قطعہ زمین اور فطری ذخائر کی زیادہ دیکھ بھال کریں گے بہ نسبت گمنام کمپنیوں یا قوت کے نشے میں مست حکومتوں کے جو ساری سرزمین کو اپنی شکارگاہ تصور کرتی ہیں۔

آلات اور مشینوں کی تیسری خصوصیت سب سے زیادہ اہم ہے یعنی یہ کہ طریق کار اور آلاتِ کار ایسے ہونے چاہیں جو انسان کے تخلیقی پہلو کے لیے بھی گنجائش رکھیں۔ رومن چرچ کے سربراہوں نے اس کے متعلق پچھلے سو برسوں میں اس پہلو پر بہت زور دیا ہے۔ اگر عمل پیداوار کے دوران میں انسانیت کے پہلو کو ''عمل سے خارج کر دیا جائے اور اسے محض میکانکی عمل سمجھا جائے'' تو ایسی صورت میں خود انسان پر کیا بیتے گی؟ انسان مسخ شدہ آزاد وجود بن جائے گا۔

''اس طرح جسمانی محنت کو (بقول پوپ پائی دواز دہم) گناہِ اولیں کے باوجود خدا نے انسانی جسم اور روح کے لیے عمل خیر قرار دیا جو بہت سی صورتوں میں مسخ کرنے کا آلۂ کار بن گئی ہے۔ اس لیے کہ فیکٹری کا مردہ مواد بہتر صورت میں باہر آتا ہے جب کہ وہاں انسان برباد اور ذلیل ہوتے رہتے ہیں''۔

محنت اور اس سے پیدا شدہ، تعلقات ہی انسانی معاشرے کی بنیاد ہوتے ہیں، اگر بنیاد ہی ناقص ہو تو معاشرے کی عمارت کس طرح پائیدار ہو سکتی ہے؟ اور اگر پورا معاشرہ مرض میں مبتلا ہو جائے تو یہ امن عامہ کے لیے بھلا کیوں خطرہ نہ بنے گا؟

ڈوروتھی ایل سیرز کا خیال ہے کہ ''جنگ ایسے معاشروں کا محاکمہ ہے جو قوانین کائنات سے شدید طور پر منحرف ہونے والے خیال پر پلتے ہیں..... یہ مت سوچیے کہ جنگ غیر منطقی تباہی کا نام ہے۔ یہ اس وقت ہوتی ہے جب غلط تصورات اور غلط طرز حیات ناقابل برداشت صورت حال کو جنم دیتے ہیں۔'' معاشی طور پر ہمارا غلط طرز زندگی حرص اور رشک کے منظّم فروغ سے اور فضول قسم کی لامتناہی ضرورتوں کی تشکیل سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر جدید انسان پر حرص کی حاکمیت نہ ہوتی جس کی اعانت میں رشک برابر کا شریک ہے تو ''اعلیٰ معیارِ زندگی'' کے حصول کے باوجود اقتصادی دوڑ کیوں جاری رہتی؟ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بالخصوص امیر ترین معاشرے ہی اپنے معاشی مفادات کو نہایت سفاکی سے حاصل کر رہے ہیں آخر اس بات کی وضاحت کس طرح ہو سکتی ہے کہ امیر معاشروں کے حکمران، خواہ وہ معاشرے انفرادی ملکیت کی بنا پر قائم ہوں یا اجتماعی ملکیت کی بنا پر، محنت میں انسانی رویوں کی شمولیت سے کیوں گریزاں ہیں۔ محض یہ بات ضروری سمجھی جاتی ہے کہ یہ دعویٰ کر دیا جائے کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا جس کے باعث ''معیارِ زندگی'' کم ہو جائے گا اور پھر ہر قسم یک بحث ختم کر دی جاتی ہے۔ اس قسم کی روح کش، لایعنی، میکانکی، یکسانیت زدہ اور مجنونانہ بحث یقیناً یا تو فراریت پر منتج ہوگی یا تشدد پر ''روٹی اور سرکس'' کی بڑی سے بڑی مقدار بھی اتنی بڑی تباہی کی تلافی نہیں کر سکتی۔ یہ وہ صداقتیں ہیں جن کا نہ تو اقرار کیا جاتا ہے اور نہ انکار بس خامشی کی ایک نہ ختم ہونے والی سازش قائم ہے۔ انکار واضح حماقت اور اقرار موجودہ معاشروں کے مرکزی تصورات کو انسان دشمن تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ آج بیماری کے اسباب کو زیادہ شدید بنا کر بیماری کا علاج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بیماری کا سبب یہ ہے کہ عقل کی جگہ چالاکیوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ چالاکی سے کی جانے والی کوئی تحقیق بیماری کا علاج نہیں ڈھونڈ سکتی۔ لیکن عقل کیا ہے؟ کہاں سے ملے گی؟ اور یہیں ہم بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے بارے میں یوں تو ہم بہتیری کتابیں پڑھ سکتے ہیں مگر دراصل یہ ہمیں اپنی ذات کے اندر ملے گی۔ اسے پانے کے لیے ہمیں سب سے پہلے حرص اور رشک کی محکومیت سے آزاد ہونا پڑے گا۔ اس آزادی سے حاصل شدہ سکون، خواہ وہ لمحاتی ہی

کیوں نہ ہو، عقل کی وہ روشنی مہیا کرتی ہے جسے کسی اور طریقے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے ذریعے ہمیں زندگی کی اس بے سکونی اور کھوکھلے پن کا اندازہ ہو سکے گا جو روحانی ضروریات کو بھول کر محض مادی اغراض کو پورا کرنے میں صرف ہو رہی ہے۔ ایسی زندگی انسان کو انسان کے خلاف اور ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف صف آرا کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کی ضروریات لامحدود ہیں اور لامحدود کا حصول محض روحانی دنیا میں ممکن ہے، مادی دنیا میں مطلق نہیں۔ آدمی کی ضرورت یہ ہے کہ وہ اس ہنگامہ پرور دنیا سے بالاتر ہو جائے۔ عقل اسے اس کی راہ دکھاتی ہے۔ عقل کے بغیر وہ ایک وحشت ناک معیشت کو پیدا کرتا ہے جو دنیا کی بربادی کا سبب بنتی ہے اور چاند پر آدمی کو بھیج کر اعجوبہ تسکین حاصل کرتا ہے۔

جنگوں کے اصل اسباب یہی ہیں۔ انہیں ختم کیے بغیر امن و آشتی کی بنیاد رکھنا بے بنیاد بات ہے اس سے بڑھ کر احمقانہ بات یہ ہے کہ امن کو معاشی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی جائے۔ معیشت تو حرص اور رشک کے منظّم فروغ کا تقاضا کرتی ہے اور یہی دونوں قوتیں انسانوں کے درمیان منافشہ پیدا کرتی ہیں۔

دنیا میں صحیح امن محض اُسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب ہم حرص، رشک، نفرت اور ہوس کو اپنی ذات میں ختم کر دیں۔ اس کا امکان اس وقت ہوگا جب ہم یہ تسلیم کر لیں کہ جسم کے علاوہ ایک روح بھی ہے۔ روح کی ایک مستقل حیثیت ہے۔ اسے محض تسلیم ہی نہ کریں بلکہ عقیدہ بنا لیں۔

MashalBooks.com

معیشت کا کردار

یہ کہنا تو خیر مبالغہ ہے کہ ہمارے معاشی مستقبل کا تعین ماہرین اقتصادیات کر رہے ہیں تاہم اس میں شک بھی نہیں کہ ان کا ہماری زندگی پر اثر بہت گہرا ہے۔ عہد جدید کی زندگی کے مختلف اعمال کی تشکیل میں اقتصادیات مرکزی کردار ادا کرتی ہے کہ یہی نفع بخش اور غیر نفع بخش کا معیار متعین کرتی ہے۔ افراد، گروہوں اور حکومتوں کے اعمال کو کوئی اور معیار اتنا متاثر نہیں کرتا جتنا کہ اقتصادی معیارات۔ لہٰذا آپ یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جدید عہد کے خطرات اور مشکلات سے بچنے کے لیے ہمیں ماہرین اقتصادیات سے مشورہ کرنا چاہیے۔ ان سے یہ پوچھنا چاہیے کہ امن وسلامتی کے لیے بہتر اقتصادی نظام کون سا ہوگا؟

تاہم دیکھنا یہ ہے کہ پچھلے ابواب میں جن مسائل کا ذکر کیا گیا ہے، ان سے اقتصادیات کا کیا تعلق ہے؟ آج سے تقریباً پونے دو سو برس پہلے جب آکسفورڈ یونیورسٹی میں شعبہ اقتصادیات کے پہلے پروفیسر ناسو سینیر کا تقرر ہوا تو انہوں نے اپنی اولین تقریر میں اس نئے علم کے بارے میں یہ پیش گوئی کی کہ یہ ''عوام کی نگاہوں میں اپنی دلچسپیوں اور افادے کے حوالے سے ایک اخلاقی علم کا درجہ حاصل کرلے گا'' انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''دولت کمانا..... عام انسانوں کے لیے ان کی اخلاقیات کو مزید بہتر بنانے کا ذریعے ہوگا'' ہمارے اپنے زمانے میں لارڈ کینز نے بھی اپنے اس مشورے کے برعکس (جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں) کہ ''حرص، حسد اور احتیاط ابھی کچھ مدت تک ہمارے اوتار بنے رہنے چاہیں'' یہ تنبیہ بھی کی تھی کہ ''ہمیں معاشی مسائل کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے اور اس کی مفروضہ ضرورتوں پر دوسرے بڑے اور مستقل مسائل کو قربان نہیں کرنا چاہیے''۔

آج ایسی آوازیں سننے میں نہیں آرہی ہیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ دولت کی زیادتی کے ساتھ اقتصادیات آج کے انسان کا مرکزی مسئلہ بن گئی ہے۔ معاشی کارگزاریاں، معاشی ترقی، معاشی توسیع وغیرہ جدید معاشرتوں کی بنیادی دلچسپیوں کا مرکز ہیں۔ اگر آج کسی عمل کو غیر اقتصادی قرار دیا جائے تو اس کے وجود کے حق پر محض انگلی نہیں اٹھائی جائے گی بلکہ اُسے زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔ اقتصادی ترقی کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ باعث شرم

سمجھی جاتی ہے۔ آپ کسی چیز کو غیر اخلاقی اور بدشکل کہہ لیں، اسے روح کی بربادی اور انسان کی تذلیل بتائیں، امن عامہ کے لیے یا آئندہ آنے والی نسل انسانی کے لیے شدید خطرناک ثابت کردیں تاہم جب تک آپ اُسے ''غیر اقتصادی'' نہیں بتائیں گے اس وقت تک آپ اس کے وجود، اس کے نمو اور پھلنے پھولنے کے حق کو چیلنج نہیں کرسکتے۔

لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی چیز غیر اقتصادی ہے تو آخر اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے؟ عام طور پر مفہوم یہ ہوتا ہے کہ یہ ایک بیماری ہے جو نہ ہو تو ہماری صحت بہتر ہوسکتی ہے۔ ماہر اقتصادیات ہی اس بیماری کی تشخیص کرسکتا ہے اور اپنی تدبیر سے اسے دور بھی کرسکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ماہرین اقتصادیات اس سلسلے میں متفق نہیں ہوتے۔ تشخیص کے بارے میں بھی لیکن۔ اس سے محض یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موضوع خصوصی طور پر بہت مشکل ہے اور دوسرے انسانوں کی طرح ماہرین اقتصادیات بھی غلطی کرسکتے ہیں۔

تاہم میرا یہ سوال اور ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ اقتصادیات کا طریق کار اس لفظ کے بارے میں کس قسم کا مفہوم پیدا کرتا ہے؟ اس سوال کا جواب یقیناً یہی ہوگا کہ ہر وہ چیز اس وقت غیر اقتصادی ہوجاتی ہے جب وہ رقم کی صورت میں خاطر خواہ نفع فراہم نہیں کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی مفہوم ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی معاشرہ، کوئی گروہ یا معاشرے کا کوئی فرد خواہ کوئی کام بھی معاشرتی، جمالیاتی، اخلاقی، سیاسی، نوعیت کا کرے وہ ہر صورت میں غیر اقتصادی ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اقتصادیات کا ہر محاکمہ محض یک سطحی ہوتا ہے۔ زندگی کے بے شمار پہلو ہوتے ہیں اور حقیقی زندگی میں کوئی فیصلہ کرنے کے لیے یہ لازم ہے کہ ان تمام پہلوؤں کو بیک وقت سامنے رکھا جائے۔ اقتصادیات محض ایک ہی پہلو سامنے رکھتی ہے اور وہ یہ کہ آیا جو کچھ آدمی کررہا ہے اس سے نفع کی کوئی رقم حاصل ہوتی ہے یا نہیں!

ان صنعتوں میں بھی، جو قومی ملکیت شمار ہوتی ہیں، نفع کی ایک خاص بالائی سطح مقرر کردی جاتی ہے اور اس سطح تک پہنچنا صنعت کے لیے ضروری ہوتا ہے خواہ اس سے قومی معیشت کے دوسرے شعبوں کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچ جائے۔ آج تمام سیاسی جماعتوں کا اس بات پر ایمان ہے کہ عوام کے مفاد میں ہر شخص کو، ہر صنعت کو، خواہ وہ قومی ملکیت ہو یا نجی، ایک مقررہ رقم بطور منافع کمانی چاہیے۔

بہرحال اقتصادی محاکے کا یک رُخا پن مسلم ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ماہرین

اقتصادیات ''مختصر مدت'' کو بہتر صورت ''طویل مدت'' پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے کہ طویل مدت میں، جیسا کہ لارڈ کینز نہایت پُرمسرت سفا کی سے اعلان کرتے ہیں، ہم سب مر جائیں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ سرمائے کی ذیل میں ان ''مفت اشیاء'' کو نہیں لاتے جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ماحول کو انتہائی درجے پر ہی کیوں نہ برباد کر رہا ہو اور اس کے برعکس وہ عمل، جو ماحول کو محفوظ کرنے کی قیمت ادا کر رہا ہو، غیر اقتصادی ہوگا۔

چونکہ اقتصادیات کا بنیادی نقطہ نظر بہر صورت نفع کمانا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ بات اقتصادی طریق کار میں مضمر ہے کہ آدمی کے فطرت پر انحصار کو در خورِ اعتنا نہ سمجھا جائے۔ اسی بات کو اس طرح بھی کہہ سکتے کہ اشیا اور محنت کو اقتصادیات ہمیشہ ''بازار'' کے نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے جہاں بہ خوشی خریدنے والے بہ خوشی بیچنے والوں سے ملتے ہیں۔ خریدنے والا ہمیشہ قیمت کم کرانے کی فکر کرتا ہے۔ اُسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ اشیا کہاں، کیسے اور کن حالات میں بنائی گئیں۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی رقم کی زیادہ سے زیادہ قدر متعین کرائے۔

ان حالات میں ''بازار'' معاشرے کی محض بالائی سطح کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کی اہمیت بھی لمحاتی ہوتی ہے۔ وہاں اس بات کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ زیادہ گہرائی میں جایا جائے، اشیا کے پیچھے جو فطری یا معاشرتی حقائق ہیں اُنہیں سمجھا جائے۔ ایک مفہوم میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''بازار'' انفرادیت پسندی اور غیر ذمہ داری کو ادارہ بنا دینے کا نام ہے۔ خریدنے والا اور فروخت کرنے والا دونوں اپنے علاوہ کسی اور شے کے لیے ذمہ دار نہیں ہوتے۔ یہ بات غیر اقتصادی ہوگی کہ کوئی دولت مند فروخت کنندہ، غریب خریداروں کے لیے اشیا کی قیمت کم کردے یا کوئی دولت مند خریدار کسی غریب فروخت کنندہ کے مال کو زیادہ قیمت دے کر خرید لے۔ اسی طرح یہ بات بھی غیر اقتصادی ہوگی کہ کوئی خریدار مہنگے سودیشی مال کو سستے درآمد شدہ بدیشی مال پر فوقیت دے۔ اس سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے ملک کی ادائیگی کے توازن کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری قبول کرے۔

معیشت کی دنیا، جس میں ''مقدار'' کا راج ہوتا ہے اپنی فتوحات کا جشن ''بازار'' میں مناتی ہے۔ اشیا کو دوسری اشیا کے برابر رکھا جاتا ہے۔ ایک شے کو دوسری شے کے برابر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی قیمت مقرر کی جائے۔ محض اسی طرح اُن کا آپس میں تبادلہ ہوسکتا ہے۔

MashalBooks.com

جس تناسب سے اقتصادی تصورات ''بازار'' کے حوالے سے متعین ہوتے ہیں اسی تناسب سے زندگی سے برکت اُٹھتی جاتی ہے۔ اس لیے کہ ہر اُس شے میں، جس کی قیمت مقرر ہو، کسی قسم کی برکت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس بات میں کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اگر سارے معاشرے پر اقتصادی تصورات حاوی ہو جائیں تو ایسی تمام غیر اقتصادی اقدار مثلاً حسن، صحت، صفائی وغیرہ محض اس صورت میں زندہ رہ سکتی ہیں جب وہ خود کو ''اقتصادی قدر'' کا حامل ثابت کر سکیں۔

غیر اقتصادی اقدار کو اقتصادی اعداد و شمار کے دائرے میں لانے کے لیے ماہرین اقتصادیات قیمت/منافع کا تجزیاتی طریق کار استعمال کرتے ہیں۔ عام طور پر اسے روشن خیالی اور ترقی پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس لیے کہ کم از کم اس طریقے سے اُن کی قیمت اور منافعے کا حساب تو لگایا جاتا ہے، ورنہ بہ صورت دیگر انہیں بالکل نظر انداز کر دیا جاتا۔ فی الحقیقت اس طریق کار سے اعلیٰ کو ادنی کی سطح پر گھسیٹ لیا جاتا ہے اور بے بہا شے کی ایک قیمت متعین کر دی جاتی ہے۔ تاہم اس سوچ کی منطقی لایعنیت ہی اس کی واحد خرابی نہیں ے۔ اس سے بھی خراب اور تمدنِ انسانی کو تباہ کر دینے والی بات یہ مفروضہ ہے کہ ہر شے کی ایک قیمت ہوتی ہے یا بہ الفاظِ دیگر پیسہ ہی سب سے بڑی قدر ہے۔

ہر سائنس محض اپنے حدود میں ہی رہ کر فائدہ مند ہو سکتی ہے لیکن جیسے ہی وہ اپنی حد سے باہر نکلتی ہے تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ آج اقتصادیات کی سائنس سب کچھ ہڑپ کر لینا چاہتی ہے۔ آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے ہی ایڈورڈ کاپلسٹن نے اس خطرے کی طرف اشارہ کیا تھا، اس لیے کہ اس خطرے کا تعلق ان طاقتور انسانی محرکات سے ہے جنہیں ہم رشک اور حرص کے نام سے پکارتے ہیں۔ ماہرین کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ اپنی اس سائنس کے حدود کا تعین کریں یعنی بہ الفاظِ دیگر ''مافوق الاقتصادیات'' کو سمجھیں۔ آخر یہ مافوق الاقتصادیات ہے کیا؟ جس طرح اقتصادیات ماحول میں انسانوں کا مطالعہ کرتی ہے اسی طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مافوق الاقتصادیات کے دو حصے ہیں۔ ایک انسانوں سے متعلق ہے اور دوسرا ماحول ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ہم توقع کرتے ہیں کہ اقتصادیاتِ مطالعہ انسان کے ذریعے اپنے اغراض و مقاصد حاصل کرے اور کم از کم اپنے طریق کار کا ایک بڑا حصہ مطالعہ فطرت سے اخذ کرے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں بازار میں تمام سامان ایک ہی طرح سے برتے جاتے ہیں کیوں کہ بازار ایک ایسا ادارہ ہے جہاں لین دین میں بے انداز سودے بازی ہوتی ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہوا کہ یہ بات جدید اقتصادیات کے طریق کار میں مضمر ہے۔ یہ طریق کار ہی اتنا بازاری ہے کہ وہ اس بات کو خاطر میں ہی نہیں لاتا کہ انسان فطرت کا محتاج بھی ہے۔

علم اقتصادیات کا تعلق لامحدود قسم کی اشیا اور ان کی کارکردگی سے ہوتا ہے جنہیں اسی قدر لامحدود عوام پیدا کرتے اور استعمال میں لاتے ہیں۔ ایسی صورت میں جب تک ہم امتیازات کو ایک طرف نہ رکھ دیں کسی قسم کا اقتصادی نظریہ قائم ہی نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ قدری امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر نظریات قائم کرنے میں آسانی تو یقیناً ہوگی مگر وہ نظریات بالکل بنجر ہوں گے۔ ''پچھلی چوتھائی صدی کی بیشتر اقتصادی ترقی'' (پروفیسر فلپس براؤن نے جس کا حوالہ دیا ہے) مقداریت کی سمت میں ہے جو قدری امتیازات کی تفہیم سے قطع نظری کا شاخسانہ ہے۔ ماہرین اقتصادیات کے لیے یہی تصور سب کچھ ہے کہ قومی پیداوار میں ترقی ہو۔ یہ ترقی مریضانہ، غیر صحت مند، مفسدانہ یا تباہ کن ہے، یہ خیال ہی ان کے نزدیک بیہودہ ہے جسے سامنے نہیں آنا چاہیے۔ معدودے چند ماہرین آج یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ آگے کتنی ''ترقی'' ممکن ہے کیوں کہ محدود فطری ماحول میں لامحدود ترقی ناممکنات میں سے ہے۔ مگر وہ بھی ترقی کے تصور کے خالص مقداری نقطہ نظر سے آگے نہیں بڑھتے۔ بجائے اس کے کہ وہ ''قدری امتیازات'' کی اولیت پر زور دیں، وہ ''ترقی'' کی جگہ ''غیر ترقی'' پر زور دیتے ہیں اور نتیجتاً ایک خلا کو دوسرے خلا سے پر کرتے ہیں۔

''مقدار'' کو ''اقدار'' کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے برتا جا سکتا ہے، اسی طرح جس طرح گنتی گننا اور حساب جوڑنا کسی چیز کے بارے میں محاکمہ دینے سے زیادہ آسان ہے۔ ماہرین اقتصادیات کی ایک بڑی تعداد اپنی سائنس کو طبیعات کی طرح زیادہ یقینی بنانے میں مصروف ہے۔ گویا ذہن سے عاری ڈرے اور ''احسن التقویم'' انسان میں کوئی قدری امتیاز نہیں ہے۔

بازار میں تو سب کچھ مصرف میں لانے والی شے ہے۔ ماہرین کو اس سے غرض نہیں کہ کوئی شے انسان نے بنائی ہے یا خدا نے یا اسے ہمہ وقت بنایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ایک بار جب سامانِ صرف، خواہ اس کا مافوق الاقتصادی کردار کچھ ہی ہو، بازار میں آ گیا تو اسے سامانِ فروخت ہی سمجھا جائے گا اور اقتصادیات محض خریدار کی سودے بازی کے متعلق ہی نظریات قائم کرے گی۔

آج سے بہت تھوڑا ہی عرصہ پہلے تک ماہرین اقتصادیات اپنے احاطۂ کار کو ایسی موجود حقیقت سمجھتے تھے جو ہمیشہ ایک ہی طرح قائم و دائم رہنے والی ہو اور اس میں کسی نقص کا کوئی

امکان نہ ہو۔ یہ ان کا کام نہیں تھا اور نہ ان کی پیشہ ورانہ مہارت میں یہ امر شامل تھا کہ وہ احاطۂ کار اپنے اقتصادی عمل کے اثرات کا مطالعہ کریں۔ چونکہ اب ماحول کی بربادیوں کے واضح ثبوت سامنے آرہے ہیں، بالخصوص جاندار فطرت کی تباہی کے، اس لیے پورے اقتصادی نقطہ نظر اور اقتصادی طریق کار کے بارے میں شکوک ابھر رہے ہیں۔ اقتصادیات کا مطالعہ اتنا سطحی اور نامکمل ہے کہ وہ کسی قسم کی بصیرت عطا کرنے کا حامل نہیں جب تک کہ ''مابعد الاقتصادیات'' سے اس کی تکمیل نہ کی جائے۔

ذریعے کو مقصد پر فوقیت دینے کا اقتصادی رجحان، جس کی حمایت لارڈ کنیز بھی کرتے ہیں، اتنا گمراہ کن ہے کہ وہ انسان سے اس کے اعلیٰ ترین مقاصد کے انتخاب کی آزادی اور قوت بھی چھین لیتا ہے۔ یوں کہیے کہ ذریعہ ہی مقصد کا تعین کرتا ہے۔ اس کی واضح مثالیں آواز سے زیادہ تیز رفتار چاند گاڑی کی ترقی اور انسان کو چاند پر پہنچانے کی بے پناہ کاوشیں ہیں۔ ان مقاصد کے حصول میں انسانی زندگی کی ضروریات اور اس کی خواہشات کا کوئی دخل نہیں کہ یہی صنعت کا بنیادی فریضہ ہونا چاہیے۔ اس کے پیچھے محض اتنی سی بات تھی کہ اس کام کے لیے ضروری تکنیکی وسائل کے امکانات موجود نظر آئے۔

اگلے باب میں ہم اس بات پر غور کریں گے کہ اگر مغربی مادیت کی مافوق الاقتصادی بنیاد کو بدل کر اس کی جگہ بدھ مت کو رکھ دیں تو کون سے اقتصادی قوانین اور اقتصادی اور غیر اقتصادی تصورات برآمد ہوتے ہیں۔ بدھ مت کا انتخاب محض اتفاق ہے اس کی جگہ اگر عیسائیت، اسلام، ہندومت، یہودیت یا مشرق کی کسی اور بڑی روایت کی تعلیمات کو پیش نظر رکھا جائے تو بھی ایک ہی طرح کے نتائج سامنے آئیں گے۔

MashalBooks.com

بدھ اقتصادیات

مہاتما بدھ کے ہشت پہلو راہ نجات کا ایک درس یہ ہے کہ ''رزقِ حلال کماؤ''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مت میں کوئی چیز ایسی ضرور ہے جسے ہم ''بدھ اقتصادیات'' کہہ سکتے ہیں۔ بدھ ممالک اس بات پر اکثر زور دیتے ہیں کہ اپنی روایات سے وفاداری برتنی چاہیے لہٰذا برما کا یہ خیال ہے کہ ''نیا برما مذہبی اقدار اور اقتصادی ترقی کے درمیان کوئی تضاد نہیں دیکھتا۔ روحانی صحت اور مادی آسائشیں ایک دوسرے کی دشمن نہیں ہیں وہ فطری دوست ہیں۔'' یا پھر یہ دیکھیے: ''ہم اپنی مذہبی اور روحانی تعداد کو نہایت کامیابی کے ساتھ جدید صنعت کے فوائد کے ساتھ ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔'' یا یہ کہ ''ہم برمیوں کا مقدس فریضہ یہ ہے کہ ہم اپنے خوابوں اور اعمال دونوں کو اپنے عقیدے سے ہم آہنگ کریں۔ یہ ہم ہمیشہ کرتے رہیں گے''۔

ایسے ممالک کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کی اقتصادی ترقی کے منصوبوں کو جدید اقتصادی اصولوں کے مطابق تیار کر سکتے ہیں اور اس کام کے لیے وہ نام نہاد ترقی یافتہ ممالک سے جدید ماہرین کو بلاتے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے بڑے پیمانے پر اقتصادی ترقی کے منصوبے بنا سکیں خواہ وہ پنج سالہ منصوبہ بندی ہو یا کچھ اور۔ کوئی شخص بھی اس طرح نہیں سوچتا کہ بدھ مت کے طرز حیات کے لیے بدھ ماہر اقتصادیات ہی کی ضرورت ہے جیسا کہ جدید مادی طرزِ حیات نے جدید اقتصادیات کو پیدا کیا ہے۔

جہاں تک ماہرین اقتصادیات کا تعلق ہے وہ بہت سے دیگر ماہرین کی طرح بالعموم ایک مابعد الطبیعاتی کور چشمی کا شکار ہیں۔ وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کی سائنس کے حقائق مطلق اور غیر مبدل ہیں جن کی بنیاد کسی اور مفروضے پر نہیں ہے۔ بعض کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ قانونِ کشش ثقل کی طرح اُن کے قوانین بھی مابعد الطبیعات یا اقدار سے بالکل آزاد ہیں تاہم ہمیں طریق کار کی بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بجائے آیئے ہم کچھ بنیادی حقائق لیں اور یہ دیکھیں کہ اُن کے متعلق جدید ماہر اقتصادیات اور بدھ ماہر اقتصادیات کا نقطہ نظر کیا ہے۔

اس بات کو ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ دولت کا ایک بنیادی ماخذ محنت ہے۔ جہاں تک کہ جدید ماہر اقتصادیات کا تعلق ہے اس نے تو اس تصور کو پیدائشی طور پر قبول کر لیا ہے کہ ''محنت'' یا ''کام''

ضروری بدی سے ذرا ہی زیادہ حیثیت رکھتا ہے اُجر کے نقطہ نظر سے یہ بہر صورت خرچ کی ایک مد ہے جسے اگر خود کار مشینوں کے ذریعے بالکل ختم نہ کیا جا سکے تو ممکن حد تک کم کر دینا چاہیے۔ مزدور کے نقطہ نظر سے یہ ''منفی افادہ'' ہے۔ کام کرنا اپنے آرام وسکون کی قربانی دینا ہے اور تنخواہ اس قربانی کی تلافی ہوتا ہے لہٰذا اُجر کے نقطہ نظر سے آئیڈیل یہ ہے کہ کام کے بغیر آمدنی حاصل کی جائے۔ ان نقطہائے نظر کے نتائج بہت دوررس ہوں گے۔ اگر آئیڈیل یہ ہو کہ کام ہی نہ کیا جائے تو ہر وہ طریق کار جو ''کام کے بوجھ کو کم کرے'' مستحسن ہوگا۔ سب سے بہتر طریق کار، خود کار مشینوں سے ذرا ہی کم، نام نہاد ''تقسیم کار'' ہوگا۔ اس کی کلاسیکی مثال پن فیکٹری کی ہے جس کی ایڈم سمتھ نے ''دولت اقوام'' میں تعریف کی ہے۔ یہ معمولی مہارتی تخصیص کی بات نہیں ہے۔ ایسی مہارتی تخصیص تو انسانوں میں عہد قدیم سے چلی آتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پیداوار کے مکمل عمل کو بہت ہی چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ دیا جائے تا کہ مکمل شدہ پیداوار انتہائی سرعت سے حاصل ہو اور ہر شخص کا، جس نے پیداواری عمل میں حصہ لیا، کام بہت معمولی ہو اور بعض صورتوں میں تو بلا کسی ہنر کے محض اعضاء کی جنبش کا حاصل ہو۔

بدھ نقطہ نظر کے مطابق کام کرنے کے تین پہلو ہیں: اول یہ کہ کام کرنے والے کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور فرغ دینے کا موقع ہو۔ دوم یہ کہ اُسے یہ موقع حاصل ہو کہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کر کے اپنی انانیت کو زیر کرے۔ تیسرے یہ کہ ایسی اشیا اور سامان پائے جو بہتر زندگی کی ضرورتوں کو پورا کریں۔ اب اس تصور زندگی سے پیدا ہونے والے نتائج پر غور کریں تو وہ بے شمار ہوں گے۔ کام کی ایسی فضا پیدا کرنا کہ وہ کارکن کے لیے بے معنی، بیزار کن، احمقانہ یا اعصاب شکن ہو مجرمانہ عمل سے ذرا ہی کم ہوگا۔ اس سے انسانوں سے کہیں زیادہ اشیا اور سامان کے ساتھ تعلق خاطر کا اظہار ہوگا، ایسا تعلق خاطر جس کا حاصل بے رحمی اور روح فرسائی ہوگی اور جو اس دنیوی وجود کی ماقبل تاریخ کی بربریت کی یاد دلائے گی۔ اسی طرح کام کے مقابلے میں اوقاتِ آرام کے لیے تگ ودو انسانی وجود کی ایک بنیادی صداقت کی نافہمی سے تعبیر ہوگی، اس لیے کہ کام اور آرام دونوں ہی زندگی کے عمل کے دو ہم آہنگ پہلو ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کے معنی کام کرنے کی خوشی اور آرام کی لذت دونوں کی بربادی ہے۔

بدھ نقطۂ نظر سے دیکھیے تو میکانکی کام دو طرح کا ہوتا ہے: ایک وہ جو انسان کی قوت اور اس کے ہنر میں اضافہ کرتا ہے اور دوسرا وہ جو اسے مشین کا غلام بنا دیتا ہے۔ ہنر مند آدمی مشین اور

اوزار کا فرق جانتا ہے۔ اوزار انسانی ہاتھ کے تابع ہوتا ہے جب کہ مشین خود انسانی کام کر کے پوری تہذیب کے لیے تباہ کن ہو جاتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے بدھ اقتصادیات جدید مادی اقتصادیات سے بالکل مختلف ہے اس لیے کہ بدھ تصورِ حیات میں تمدن کا جوہر ضروریاتِ زندگی کو بڑھانے میں نہیں بلکہ انسانی کردار کی تطہیر میں ہے۔ کام کے ذریعے بھی کردار کی تشکیل ہوتی ہے اور اگر کام انسانی احترام اور آزادی کی فضا میں سرانجام دیا جائے تو برکت کارکنوں کے لیے بھی ہوتی ہے اور ان چیزوں میں بھی جو وہ پیدا کرتے ہیں۔ ماہر اقتصادیات اور فلسفی جے۔ سی۔ کمار پا اس بات کو یوں کہتے ہیں:

''اگر کام کی نوعیت کی صحیح تفہیم ہو اور اسے ٹھیک طرح برتا جائے تو کام انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کے لئے وہی کچھ کرے گا جو غذا انسانی جسم کے لیے کرتی ہے۔ کام اعلیٰ صلاحیتوں کو تقویت پہنچاتا اور زندگی بخشتا ہے اور انسانوں کو اعلیٰ درجے کی کارکردگی پر اکساتا ہے۔ یہ اس کی آزاد قوتِ ارادی کو صحیح راہ دکھاتا ہے اور اندر کے حیوان کو ترقی کے مدارج طے کراتا ہے۔ یہ انسان کے لیے ایک نہایت اعلیٰ پس منظر مہیا کرتا ہے جس کے مطابق وہ اپنی اقدار کا اظہار اور اپنی شخصیت کو فروغ دیتا ہے۔''

اگر کسی انسان کے پاس کوئی کام نہ ہو تو وہ پریشان ہو جاتا ہے، محض اس لیے نہیں کہ اس کی کوئی آمدن نہیں بلکہ اس لیے کہ اسے کام سے حاصل شدہ وہ نظم وضبط مہیا نہیں کر سکتا۔ جدید ماہر اقتصادیات کے نزدیک کامیابی کا بنیادی معیار کسی خاص مدت میں حاصل شدہ پیداوار کی مقدار ہے۔ بدھ نقطۂ نظر کے مطابق یہ بات صداقت کو سر کے بل کھڑا کرنے کے مترادف ہے۔ اس طرح سامانِ پیداوار انسانوں سے برتر اور اس کا استعمال تخلیقی عمل سے زیادہ اہم بن جاتا ہے۔ اس طرح کارکن سے زیادہ اہمیت سامانِ پیداوار کی ہو جاتی ہے اور زور انسانیت سے ہٹ کر غیر انسانیت پر آ جاتا ہے اور یہی بدی کی قوتوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہے۔

بدھ اقتصادی منصوبہ بندی ہر کسی ناکس کے لیے کام مہیا کرنے کے منصوبہ سے شروع ہوگی۔ یعنی مقصد ہر ایسے شخص کو کام پر لگانا ہو جو ''باہر'' کام کرنا پسند کرے۔ عورتوں کو بالعموم باہر کی دنیا میں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اگر دفاتر اور فیکٹریوں میں عورتیں بڑے پیمانے پر کام کر رہی ہوں تو یہ بات کسی بڑی ''اقتصادی ناکامی'' کا نشان ہوگی۔ بالخصوص چھوٹے بچوں کی ماؤں کا فیکٹری میں کام کرنا اور بچوں کا سڑکوں پر آوارہ پھرنا یہ بات بدھ ماہر اقتصادیات کے لیے

اتنی ہی غیر اقتصادی ہوگی جتنی کہ جدید ماہر اقتصادیات کے لیے کسی ہنرمند کارکن کا فوجی بننا۔

مادیت پسند جتنا زیادہ سامان میں دلچسپی رکھتا ہے اتنا ہی کوئی بدھ آزادی میں۔ تاہم چونکہ بدھ مت ایک ''درمیانی راہ'' ہے اس لیے جسمانی آسودگی کا مخالف نہیں۔ آزادی کی راہ میں رکاوٹ دولت نہیں دولت سے وابستگی ہے۔ خوش بخش اشیا سے خوشی حاصل کرنا نہیں، ان کے لیے تڑپنا ہے۔ لہٰذا بدھ اقتصادیات کا کلیدی عنصر سادگی اور عدم تشدد ہے۔ اقتصادی نقطۂ نظر سے بدھ طرزِ حیات کا معجزہ اس کی تعقل پسندی ہے۔ حیرت انگیز طور پر چھوٹے موٹے ذرائع اور ان سے غیر متوقع آسودگی کا حصول۔

جدید ماہر اقتصادیات کے لیے یہ بات سمجھنا بہت مشکل ہے۔ وہ تو ''معیارِ زندگی'' کو سالانہ صرف سے ناپنے کا عادی ہے۔ اُسے یقین ہے کہ زیادہ صرف کرنے والا کم صرف کرنے والے سے زیادہ خوشحال ہے۔ بدھ ماہر اقتصادیات کے نزدیک یہ تصور نہایت غیر معقول ہے۔ اس کی نظر میں مصرف تو انسانی فلاح کا محض ایک ذریعہ ہے۔ مقصد تو یہ ہونا چاہیے کہ کم سے کم مصرف سے زیادہ سے زیادہ فلاح حاصل کی جائے۔ سامانِ صرف کی ملکیت اور اس کا مصرف مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے لہٰذا بدھ اقتصادیات اس بات کو پیش نظر رکھتی ہے کہ کم سے کم ذرائع سے معینہ مقاصد کا حصول کیسے ہو۔

ہمیں اس بات پر زیادہ تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ برما میں زندگی پر دباؤ اور کھنچاؤ کی وہ صورت نہیں جو امریکہ میں ہے حالانکہ امریکہ میں بڑے پیمانے پر مشینوں کے استعمال سے محنت کی جو بچت ہوتی ہے برما میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔

سادگی اور عدم تشدد کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ کم مصرف سے زیادہ سے زیادہ تسکین اور آسودگی حاصل کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ تناؤ اور کچھاؤ کے بغیر زندگی گزارتے ہیں اور بدھ مت کی تعلیمات کے بنیادی اصولوں کو اپنی زندگی میں برتنے کی کوشش کرتے ہیں: ''بدکاری سے پرہیز کرو۔ عملِ خیر سرانجام دو''۔ چونکہ ہر جگہ طبعی ذرائع زندگی محدود ہوتے ہیں لہٰذا کم ذرائع پر زندگی بسر کرنے والے لوگ ان لوگوں کے برعکس، جو صرفِ کثیر کے عادی ہیں، ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی طرف کم مایل ہوتے ہیں۔

بدھ اقتصادیات کے نقطۂ نظر سے اقتصادی زندگی کا سب سے زیادہ معقول تصور یہ ہے کہ مقامی ذرائع سے محض مقامی لوگوں کے لیے پیداوار حاصل کی جائے۔ باہر سے درآمد اور اس کے

نتیجے میں برآمد کے لیے مال کی پیداوار غیر اقتصادی عمل ہے جو محض مخصوص حالات میں اور چھوٹے پیمانے پر جائز ہوسکتا ہے۔ جدید اقتصادیات اور بدھ اقتصادیات میں ایک اور واضح فرق ہے: ''مغربی انسان'' یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ وہ اس دنیا کا محض ایک حصہ ہے جس میں انسانوں کے علاوہ خدا کی بنائی ہوئی اور مخلوق بھی رہتی ہے۔ چونکہ دنیا پر حکومت شہروں سے کی جاتی ہے جہاں انسان دوسری مخلوقات سے کٹ جاتا ہے اس لیے ان اشیا کے بارے میں اس کا رویہ سخت ہو جاتا ہے جو انسانی زندگی کے ضامن ہوتی ہے: مثلاً پانی اور درخت۔ اس کے برخلاف مہاتما بدھ تکریم اور عدم تشدد کا درس دیتے ہیں، محض جاندار مخلوق کے ساتھ ہی نہیں بلکہ درختوں کے ساتھ بھی۔ بدھ مت کے ہر ماننے والے پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ دوسرے تیسرے سال کوئی درخت اُگائے اور دیکھ بھال کر اسے مستحکم کرے۔ بدھ ماہرِ اقتصادیات یہ ثابت کرسکتا ہے کہ اگر اسی اصول کو عالمی طور پر برتا جائے تو اس سے اعلیٰ پیمانے پر اقتصادی فروغ حاصل کیا جاسکتا ہے اور اسکی بنا پر کسی بیرونی مدد کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ جنوبی مشرقی ایشاء میں اقتصادی بدحالی (دنیا کے اور ممالک میں بھی) بڑی حد تک درختوں سے شرم ناک عدم توجہی کا نتیجہ ہے۔

جدید اقتصادیات ان اشیا میں، جن کی تجدید ہوسکتی ہے، اور ان میں، جن کی تجدید نہیں ہوسکتی، کوئی تمیز روا نہیں رکھتی۔ اس کا طریق کار ہی یہ ہے کہ وہ ہر شے کی برابری اور مقداری حیثیت کو روپے کی قیمت سے متعین کرتی ہے۔ مختلف ایندھنوں مثلاً کوئلے، پٹرول، لکڑی اور پانی کو لے لیجیے۔ جدید اقتصادیات ان کے باہمی فرق کو ان کی ایک خاص مقدار کی قیمت سے معلوم کرے گی۔ ان میں جو سستی ہے وہ قابل ترجیح ہے۔ ایسا نہ کرنا غیر منطقی اور غیر اقتصادی ہوگا۔ بدھ نقطہ نظر سے یہ صحیح نہیں ہے۔ ان کے لیے ان اشیا میں، جن کی تجدید نہیں ہوسکتی مثلاً کوئلہ اور پٹرول، اور ان میں، جن کی تجدید ہوسکتی ہے مثلاً لکڑی اور پانی، فرق مراتب ضروری ہے۔ ان اشیا کو، جن کی تجدید نہیں ہوسکتی، محض اس وقت استعمال کرنا چاہیے جب یہ ناگزیر ہو جائے اور وہ بھی نہایت احتیاط سے تاکہ ان کی زیادہ سے زیادہ بچت ہوسکے۔ انہیں لاپروائی اور افراط سے خرچ کرنا تشدد ہے۔ گو مکمل عدم تشدد اس سرزمین پر ناممکن ہے تاہم یہ انسان کا فرض ہے کہ اپنے ہر عمل میں ''عدم تشدد'' کو نصب العین بنائے۔

بدھ ماہر اقتصادیات کی نظر میں وہ لوگ جو ناقابل تجدید اشیا پر اپنی معیشت کی بنیاد رکھتے ہیں آمدنی کے بجائے سرمائے کو خرچ کرتے ہیں۔ ایسے طرزِ زندگی کو استقلال نصیب نہیں

ہوسکتا۔ ساری دنیا میں کوئلے، پٹرول اور گیس کے ذخائر غیر مساوی طور پر منقسم ہیں اور یقیناً محدود مقدار میں ہیں لہٰذا ان کا بڑے پیمانے پر استعمال فطرت کے خلاف تشدد ہے جو بالآخر انسانوں کے درمیان تشدد کی راہ ہموار کرے گا۔

آج اس سوال پر غور ضروری ہے کہ مذہبی اور روحانی اقدار سے قطع نظر کر کے جس ''جدیت'' کی راہ پر ہم چل رہے ہیں کیا وہ واقعی خاطر خواہ نتائج پیدا کر رہی ہے۔ جہاں تک عوام الناس کا تعلق ہے نتائج تباہ کن ہیں۔ دیہی معیشت کی تباہی، بے روزگاری کا فروغ اور شہروں میں ایک ایسے مزدور طبقے کی پیدائش جنہیں نہ جسمانی غذا میسر ہے نہ روحانی۔

فوری تجربات اور مستقبل کی توقعات کی روشنی میں ہم انہیں بھی بدھ اقتصادیات کے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں جو یہ سمجھتے ہی کہ روحانی اور مذہبی اقدار کے مقابلے میں اقتصادی ترقی زیادہ اہم ہے۔ یہاں مسئلہ یہ نہیں کہ ''جدید ترقی'' اور ''روایتی جمود'' میں سے کسی ایک کو منتخب کیا جائے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ ترقی کی صحیح راہ نکالی جائے۔ وہ درمیانی راہ جو مادی ''بے احتیاطی'' اور ''روایتی جمود'' کے مابین ہے یعنی ''صحیح قسم کی روزی کمانے کی راہ''۔

سائز کا مسئلہ

بچپن میں مجھے تاریخ کا یہ تصور دیا گیا تھا کہ شروع میں خاندان تھا۔ پھر خاندانوں نے آپس میں مل کر قبیلے بنائے۔ تب بہت سے قبیلے مل کر قوم بنے۔ پھر بہت سی اقوام نے مل کر اتحاد قائم کیا یا متحدہ اقوام۔ اس طرح یہ توقع کی جاتی تھی کہ آخر میں دنیا بھر کی ایک حکومت ہوگی۔ یہ کہانی سن کر مجھے اس عمل میں دلچسپی پیدا ہوئی لیکن جلد ہی یہ معلوم ہوا کہ عمل الٹی طرف ہو رہا ہے۔ پہلے اقوام متحدہ کے ممبرں کی تعداد ساٹھ تھی۔ اب وہ دگنی سے بھی زیادہ ہوگئی ہے اور یہ تعداد بڑھتی جائے گی۔ میرے بچپن میں اس صورت حاصل کو ''تقسیم بلقان'' کہتے تھے اور اِسے برا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود کہ ہر شخص اسے برا سمجھتا تھا۔ پچھلے پچاس برسوں سے زائد عرصے سے دنیا کے بیشتر حصوں میں ہو یہی رہا ہے۔ بڑے یونٹ چھوٹے یونٹ چھوٹے یونٹوں میں بٹتے جا رہے ہیں۔ اس صورت حال پر، جو میرے حاصل کیے علم سے بالکل مختلف ہے، غور ضروری ہے۔

علاوہ ازیں مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ خوشحال ہونے کے لیے ملک کا بڑا ہونا ضروری ہے۔ جتنا بڑا ہو اُتنا ہی اچھا ہے۔ مجھے یہ بات بھی صحیح لگی تھی۔ بسمارک سے پہلے کے جرمنی کو چرچل

نے ''بے چھنے جو کی روٹی'' کہا تھا۔ کیا یہ بات سچ نہیں کہ جرمنی کی خوشحالی اس کے اتحاد کے باعث ہی ممکن ہوئی؟ اس کے باوجود جرمن زبان بولنے والا سوئٹزرلینڈ اور وہی زبان بولنے والا آسٹریا، جو جرمن اتحاد میں شامل نہیں ہوئے، انہوں نے بھی اقتصادی طور پر ترقی کی۔ اب اگر ہم دنیا کے خوشحال ملکوں کی ایک فہرست بنائیں تو پتا چلے گا کہ ان میں زیادہ تعداد بہت چھوٹے ملکوں کی ہے۔ اس کے برعکس دنیا کے بڑے ملکوں میں زیادہ تعداد نہایت غریب ملکوں کی ہے۔ یہ بھی قابل غور بات ہے۔

بچپن میں مجھے ایک تیسرا تصور ''بڑے پیمانے کی معیشت'' کا ملا تھا۔ یعنی یہ کہ جدید صنعتی تقاضوں کے مطابق، قوموں کی طرح کارخانوں اور فرموں کا بھی شدید رجحان بڑے سے بڑے یونٹوں میں تبدیل ہونے کا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج ایسے بڑے سے بڑے ادارے موجود ہیں جن کی مثال تاریخ میں پہلے نہیں ملتی تاہم اس کے ساتھ ہی چھوٹے یونٹ بھی امریکہ اور انگلستان میں بڑھتے جا رہے ہیں جو نہایت خوشحال ہیں اور معاشرے کو نئی ترقیوں کا پھل پہنچا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں نظریے اور عمل کی مطابقت پیدا کرنا مشکل ہے۔ سائز کا یہ مسئلہ میرے جیسے آدمی کے لیے، جو مندرجہ بالا نظریات کا حامل رہا ہو، خاصا پریشان کن ہے۔

غور کیجیے تو آج کے بڑے اداروں میں بھی چھوٹے چھوٹے ادارے بنائے جاتے ہیں۔ جنرل موٹرز کی دیوزاد فرم اس طرح بنی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی فرموں کی فیڈریشن معلوم ہوتی ہے۔ برطانیہ کا کوئلے کا ''قومی بورڈ''، جو مغربی یورپ کی سب سے بڑی فرموں میں سے ایک ہے، اسی طور پر منظم ہوا ہے۔ اوپری ڈھانچہ وحدت کا حامل ہے مگر اس کے اندر چھوٹی چھوٹی فرمیں ایک فیڈریشن کی صورت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ہر یونٹ خودکار ہے اور اپنے طور پر سیر حاصل ہے۔ ایسے نظریہ ساز، جو عملی زندگی سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے، وہ تو ''بڑے سائز'' کا راگ الاپتے رہتے ہیں لیکن باعمل لوگوں کی یہ شدید خواہش ہے کہ چھوٹی صنعتوں کی سہولت، انسان دوستی اور انتظامی آسانی کے ذریعے سے منافع کمایا جائے۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جس کا ہر شخص مشاہدہ کر سکتا ہے۔

آیئے اب اس مسئلے پر ایک اور زاویے سے غور کریں اور یہ دیکھیں کہ آخر ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے؟ انسانی معاملات میں دو ایسی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں ____ آزادی اور نظم و ضبط۔ ہمیں چھوٹے چھوٹے خودکار آزاد یونٹوں کی آزادی بھی

درکار ہے اور بڑے بڑے یونٹوں کی تنظیم اور ان کے داخلی اتحاد کی بھی _____ جب عمل کی بات آئے تو ہمیں چھوٹے یونٹوں کی ضرورت ہوگی اس لیے کہ عمل نہایت انفرادی مسئلہ ہوتا ہے اور کوئی شخص بھی کسی ایک وقت میں انسانوں کی محدود تعداد سے ہی تعلق رکھ سکتا ہے لیکن جب خیالات کی دنیا کی بات ہو یا اصولوں اور اخلاقیات کی تو ضرورت اس بات کی ہوگی کہ ہم متحدہ انسانیت کو پیش نظر رکھیں اور اسی تفہیم پر اپنے عمل کی بنیاد قائم کریں اسی بات کو دوسری طرح یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یوں تو سارے انسان بھائی بھائی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اپنے فعال ذاتی تعلقات میں ہم بہت کم لوگوں سے برادرانہ سلوک کر سکتے ہیں۔ ہم ایسے لوگوں کو بخوبی جانتے ہیں جو ایک طرف تو عالمی برادری کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے ہمسایوں سے دشمنی رکھتے ہیں۔ اسی طرح ہم ایسے لوگوں سے بھی واقف ہیں جو اپنے تمام ہمسایوں سے تو محبت کرتے ہیں لیکن اپنے دائرے سے باہر مختلف انسانی گروہوں سے نفرت کرتے ہیں۔

میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ سائز کے معاملے میں انسانی ضرورت کی دوئی ہے۔ اس کا ایک جواب نہیں ہے۔ مختلف مقاصد کے لیے مختلف ڈھانچوں کی ضرورت ہوتی ہے، بڑے بھی اور چھوٹے بھی۔ یہ بات مشکل ہے کہ لوگ سچائی کے دو مختلف پہلو بیک وقت اپنے ذہن میں رکھیں۔ وہ ہمیشہ ''مستقل حال'' کی تلاش میں ہوتے ہیں گویا اصل زندگی میں موت کے علاوہ بھی کوئی مستقل حل ہوسکتا ہے! ہمارا اصل کام یہ ہے کہ ہم ایک ''توازن'' حاصل کریں۔ آج ہم ''دیوزادیت'' کی پرستش میں مبتلا ہیں اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ جہاں بھی ممکن ہو ''چھوٹے پن'' کی ضرورت پر زور دیا جائے۔ (اگر اس کے برعکس موضوع اور مقصد سے قطع نظر کرتے ہوئے ''چھوٹے پن'' کی پوجا شروع ہو جائے تو ضرورت اس بات کی ہوگی کہ اس کی مخالف سمت پر زور دیا جائے)۔

ہر عمل کا ایک پیمانہ ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ فعال اور مخلصانہ عمل ہوگا اور جتنے کم آدمی اس میں حصہ لیں گے اتنا ہی تعلقات کو مستحکم کرنے کی ضرورت زیادہ ہوگی۔ مثال کے طور پر تعلیم کو لے لیجیے۔ اس سلسلے میں ہم بڑی بحثیں سنتے ہیں کہ مشینوں کے ذریعے تعلیم دیگر طریقہائے تعلیم پر فوقیت رکھتی ہے۔ تاہم غور کرنا چاہیے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیا پڑھا رہے ہیں؟ ہم پر یہ کھل جائے گا کہ بعض چیزیں محدود طور پر محض قریبی لوگوں کو بتائی جاسکتی ہیں جب کہ بعض دوسری عوام الناس کو ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسری تعلیمی مشینوں کے ذریعے سے۔

سوال یہ ہے کہ کون سا پیمانہ درست ہے؟ جواب اس بات پر منحصر ہے کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً یہ سوال کہ کسی شہر کا مناسب طول وعرض کیا ہونا چاہیے؟ یہ سوال بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ کسی ملک کا مناسب طول وعرض کیا ہونا چاہیے؟ ایسے سوالوں کے جواب کمپیوٹر سے حاصل نہیں کیے جاسکتے۔ زندگی کے سنجیدہ مسائل کا حل اعداد وشمار کے ذریعے ممکن نہیں ہم یہ شمار نہیں کر سکتے کہ حق کیا ہے لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ باطل کیا ہے۔ لیکن ہم اُنہیں ان کی انتہائی صورتوں میں ہی جانتے ہیں۔ ہم عام طور پر ان کے درمیان حد بندی قائم نہیں کر سکتے کہ یہ کہہ سکیں: ''اسے پانچ فیصد زیادہ یا اُسے پانچ فیصد کم ہونا چاہیے''۔

اب شہر کے طول وعرض کے متعلق سوال لے لیجئے۔ حتمی طور پر تو اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا تاہم بلا خوف تردید اس کی بالائی حد پانچ لاکھ آبادی تک مقرر کی جاسکتی ہے۔ اس سے زیادہ آبادی شہر کی خوبیوں میں اضافہ نہیں کر سکتی۔ لندن یا ٹوکیو یا نیویارک میں لاکھوں انسان شہر کی اصل قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس بے پناہ مسائل پیدا کر کے انسانی تذلیل کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ البتہ نچلی سطح کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاریخ کے نہایت نفیس شہر بیسویں صدی کے معیار سے بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ شہر تہذیب کے آلات کار ہیں اور اداروں کا انحصار کسی حد تک دولت پر ہے۔ کتنی دولت چاہیے؟ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ شہر کس قسم کی تہذیب چاہتا ہے۔ فلسفے، فنون اور مذہب کے لیے تو بہت کم رقم کی ضرورت ہے۔ دوسری قسم کے کام، جنہیں ''اعلیٰ تہذیب'' کا نام دیا جاتا ہے مثلاً خلائی تحقیق اور جدید طبیعیات، ان پر بے انداز دولت خرچ ہوتی ہے، لیکن یہ کسی حد تک انسانوں کی اصل ضروریات کی حدود سے باہر ہیں۔

''دیوزادیت'' کی پرستش، جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں، جدید صنعتوں کا سبب بھی ہے اور ان کا نتیجہ بھی _____ بالخصوص رسل ورسائل کے سلسلے میں۔ رسل ورسائل کے انتہائی ترقی یافتہ نظام کا ایک انتہائی طاقتور اثر یہ ہے کہ اس نے لوگوں کو ''سبک پا'' بنا دیا ہے۔

لاکھوں آدمی دیہاتوں اور قصبات کو چھوڑ کر بڑے شہروں کی طرف بھاگتے ہیں جس سے شہروں کو مریضانہ فروغ ملتا ہے۔ امریکہ میں آج کل ماہرین عمرانیات عظیم شہروں کے مسائل کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ امریکہ کے تین علاقوں میں آبادی کا جم غفیر اکٹھا ہو گیا ہے۔ بوسٹن سے واشنگٹن تک کے علاقے میں چھ کروڑ کی آبادی ہے۔ شکاگو کے آس پاس بھی چھ کروڑ کی آبادی

ہے۔اسی طرح مغربی ساحل پر سن فرانسکو سے سن ڈیگو تک کی آبادی چھ کروڑ ہے۔باقی ماندہ ملک تقریباً خالی ہے۔

دنیا میں ہر چیز کو ایک ڈھانچے کی ضرورت ہے ورنہ نتیجہ انتشار ہوگا۔ذرائع رسل ورسائل کی عام ترقی سے پہلے ڈھانچہ موجود تھا اس لیے کہ لوگ مقابلتاً ایک جگہ قائم رہتے تھے۔صرف وہ لوگ، جو حرکت چاہتے تھے، ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔آئرلینڈ سے تو مذہبی رہنماؤں کا ایک سیلاب اُمنڈتا تھا اور وہ سارے یورپ میں گھومتے تھے۔اس وقت بھی سامانِ رسل و رسائل تھے۔لوگ پھرتے پھراتے تھے لیکن ''سبک پائی'' نہیں تھی۔اب قباحت یہ ہے کہ ڈھانچے کا بہت بڑا حصہ ڈھے چکا ہے۔

تمام عالم انسانی کے لیے ڈھانچے کا ایک خاص عنصر ریاست ہے۔اس ڈھانچے کی حد بندی قومی سرحدوں سے ہوتی ہے۔جدید ٹیکنیکی مداخلتوں سے پہلے سرحدیں محض سیاسی اور خاندانی ہوتی تھی۔سرحدیں سیاسی قوت کی حدود متعین کرتی تھیں کہ آپ جنگ کی صورت میں کتنی فوج اکٹھی کر سکتے ہیں۔ماہرین اقتصادیات نے ایسی سرحدوں کی مخالفت کی کہ یہ معاشی عمل میں مداخلت ہے۔ایسی ہی صورت حال نے آزاد تجارت کا نظریہ پیدا کیا۔لیکن اس وقت اشیا اور آدمی ''سبک پا'' نہیں تھے۔ذرائع رسل و رسائل مہنگے تھے اس لیے سامانوں اور لوگوں کی آمدورفت کم تھی۔صنعتی دور سے پہلے تجارت اشیائے ضرورت کی نہیں صرف قیمتی پتھروں، قیمتی دھاتوں، سامان تعیش، مسالوں اور غلاموں کی ہوتی تھی۔زندگی کی بنیادی ضرورتیں مقامی طور پر پوری کی جاتی تھیں۔تباہی و بربادی کے ادوار کے علاوہ نقل وحرکت محض وہ لوگ کرتے جن کے پاس کوئی خاص وجہ ہوتی تھی۔مثلاً آئرلینڈ کے مذہبی رہنما یا پیرس کی یونیورسٹی کے دانشور۔اب تو یہ حالت ہے کہ ہر چیز اور ہر شخص حرکت میں ہے۔تمام ڈھانچے خطرے میں ہیں اور ہر ڈھانچہ ایسی ضرب کی زد میں ہے کہ جس کے بعد اس کا وجود ہی ناپید ہو جائے گا۔

اقتصادیات، جس کے بارے میں لارڈ کینیز کا یہ خیال تھا کہ بالآخر دندان سازی کی طرح ایک معمولی پیشہ بن جائے گی، یک بیک سب سے اہم موضوع بن گئی ہے۔حکومتوں کی پوری توجہ اقتصادی منصوبوں پر ہوتی ہے جب کہ اس کے ساتھ ہی اس کی ناتوانی بھی بڑھتی جاتی ہے۔وہ معمولی چیزیں، جو آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے آدمی کو بہ آسانی حاصل ہو سکتی تھیں، آج ناقابل حصول ہیں۔اقتصادیات کے سحر نے خارجہ پالیسی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔یہ کہا

جاتا ہے کہ ''ہم ایسے لوگوں کے ساتھ چل نہیں سکتے لیکن کیا کریں اقتصادی طور پر ان کے تابع ہیں لہٰذا ان کی دلجوئی لازمی ہے''۔ اس نے اخلاقیات کو بھی ہضم کرلیا ہے اور ہر انسانی موقف پر فوقیت حاصل کرلی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ یہ ایک مریضانہ صورتِ حال ہے اور اس کی بہت سی جڑوں میں سے کچھ جڑیں صنعتی ترقی کے رسل ورسائل کے پہلو سے وابستہ ہیں۔

بہت سے لوگ نہایت سادہ دلی سے یہ سمجھتے ہیں کہ جدید تیز رفتار سامانِ نقل وحرکت ہمارے سامنے آزادی کی نئی راہیں کھولتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہی ہماری آزادی کو سلب بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے ہر چیز کو نہایت کمزور اور نہایت غیر محفوظ بنادیا ہے۔ ان کی تباہ کاریوں سبب جاننے کے لیے آج بہت باشعور پالیسیوں اور باشعور عمل کی ضرورت ہے۔

بڑے ملکوں میں یہ تباہ کن اثرات زیادہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں سرحدیں ملک کا ڈھانچا متعین کرتی ہیں۔ کسی شخص کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ اپنے ملک کی سرحدوں کو پار کرکے، اپنے وطن سے اپنی جڑیں اُکھاڑ کر کسی دوسرے ملک میں قائم کرے۔ البتہ وہ اپنے ملک میں نقل وحرکت کرسکتا ہے۔ لہٰذا ''سبک پائی'' کے مضر اثرات اتنے ہی زیادہ ہوں گے جتنا ملک وسیع ہوگا۔ اس کے تباہ کن اثرات امیر اور غریب دونوں ملکوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بڑے ملکوں میں اس کے اثرات ''عظیم شہروں'' کے تصور کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ یہ لوگوں میں ''اجنبیت'' کے اثرات کو بڑھاتے ہیں اس لیے کہ ''سبک پا'' لوگ کسی جگہ، کسی سوسائٹی میں جگہ نہیں پاتے۔ ایسے مسائل مثلاً جرائم، بے تعلقی، اعصابی دباؤ، معاشرتی آشوب وغیرہ کا تعلق براہِ راست اسی صورت حال سے ہے جو خاندان تک کو متاثر کرتی ہے۔ غریب ممالک میں اس کا نتیجہ ہجوم کا شہروں کی طرف رُخ اور عام بے روزگاری ہوتا ہے اور چونکہ دیہی علاقوں سے افرادی قوت نکل جاتی ہے اس لیے قحط کے خطرے کا بھی سامنا ہوجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ ایک ایسا طبقاتی معاشرہ ہوتا ہے جس کے اندر کوئی وحدت نہیں ہوتی اور جس میں بے حد سیاسی عدم استحکام ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر پیرو کو لیجیے۔ ۱۹۲۰ء میں اس کی آبادی پونے دو لاکھ تھی۔ آج اس کی آبادی کم بیش تیس لاکھ ہے۔ آج یہ خوبصورت ہسپانوی شہر افلاس کے مارے ہوؤں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ کچی آبادیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ محض یہی نہیں تقریباً ایک ہزار آدمی روزانہ کے حساب سے شہر میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ اطرافِ شہر کی کچی آبادیوں میں زندگی کا معاشرتی اور نفسیاتی

ڈھا چا شکستہ ہو چکا ہے۔ ''سبک پا'' ہر روز ہزاروں کی تعداد میں شہر میں آنے کی کوشش کرتے ہیں اور پولیس انہیں باہر دھکیلنے کی کوشش کرتی ہے۔ ''سبک پاؤں'' کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی خالی جگہ پر مٹی کی کھولی بنالیں اور ملازمت کی تلاش کریں۔ کوئی یہ نہیں جانتا کہ ان کے بارے میں کیا کیا جائے اور اس نقل و حرکت کو کیسے روکا جائے۔

چھوٹے آزاد ملکوں کی معیشت کے بارے میں کیا گفتگو ہو سکتی ہے؟ کوئی شخص اس مسئلے پر کیسے بحث کر سکتا ہے جو مسئلہ ہی نہیں ہے۔ استحکام ریاستوں یا قوموں کا نہیں ہوتا، مسئلہ لوگوں کے استحکام کا ہوتا ہے۔ میری اور آپ کی طرح کے افراد کا۔ ہم اس وقت مستحکم ہوتے ہیں جب اپنے پیروں پر کھڑے ہوں اور روزی کما ئیں۔ آپ غیر مستحکم لوگوں کو اس طرح مستحکم نہیں بنا سکتے ہیں کہ اُنہیں ایک بڑی قوم کا حصہ بنا دیں اور آپ مستحکم لوگوں کو اس طرح غیر مستحکم نہیں بنا سکتے کہ ایک بڑی قوم کو چھوٹے چھوٹے زیادہ متحد، زیادہ مضبوط اور زیادہ قابل انتظام گروہوں میں تقسیم کر دیں۔ بہت سے لوگ یہ سوال اُٹھاتے ہیں: ''اس وقت کیا ہوگا جب کسی ملک میں کوئی زیادہ امیر صوبہ دیگر غریب صوبوں سے ناتہ توڑ کر الگ ہو جائے۔؟'' شاید زیادہ صحیح جواب یہ ہے: ''کچھ نہیں ہوگا''۔ امیر زیادہ امیر ہوتا رہے گا اور غریب زیادہ غریب بنتا جائے گا۔ ''لیکن علیحدہ ہونے سے پہلے امیر صوبہ اگر غریب صوبوں کی مالی امداد کرتا ہو تو پھر؟''

پھر امداد یقیناً بند ہو جائے گی۔ تاہم امیر غریب کی امداد کم ہی کرتے ہیں۔ زیادہ تر وہ اُن کا استحصال کرتے ہیں خواہ براہِ راست ایسا نہ کر سکیں لیکن تجارت کے حوالے سے کرتے ہیں۔ اس صورت حال پر پردہ ڈالنے کے لیے وہ بے شک ٹیکسوں کی آمدنی میں سے انہیں کچھ زیادہ دیں گے یا پھر عمل خیر کے طور پر چھوٹی موٹی امداد کر دیں گے لیکن وہ آخر دم تک علیحدگی نہیں چاہیں گے۔

البتہ عام صورت حال یہ ہے کہ غریب صوبے علیحدگی چاہتے ہیں لیکن امیر انہیں ساتھ رکھنا چاہتے ہیں اس لیے کہ وہ یہ جانتے ہیں اپنی سرحدوں کے اندر رہ کر غریبوں کا استحصال زیادہ آسان ہے بہ نسبت سرحدوں کے باہر۔

میرے خیال میں استحکام کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اگر کوئی ملک ساری دنیا میں اپنی برآمدات پھیلانا چاہتا ہے اور ساری دنیا سے سامان درآمد کرنا چاہتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے ساری دنیا کو فتح کرے پھر یہ کام سرانجام دے۔

بڑی داخلی منڈی کی اشد ضرورت کے متعلق کیا تصور قائم کیا جائے؟ اگر ''بڑے'' کے معنی

سیاسی سرحدوں کے ہوں تو یہ محض فریب نگاہ ہوگا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خوش حال منڈی غریب منڈی سے بہتر ہے۔لیکن منڈی ملک سے باہر ہو یا ملک کے اندر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ مثال کے طور پر اگر مغربی جرمنی اپنی فوکس ویگنیں امریکہ برآمد کرنا چاہے، جو یقیناً ایک خوشحال منڈی ہے، تو اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ پہلے امریکہ کو فتح کرے۔لیکن اس بات سے فرق ضرور پڑتا ہے کہ کوئی غریب قومیت یا صوبہ کسی امیر قومیت یا صوبے کے ساتھ سیاسی طور پر تتھی کر دیا جائے اس لیے کہ نقل وحرکت میں مثلاً ''سبک پا'' معاشرے میں قانونِ غیر توازن، قانونِ توازن کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔کامیاب صوبہ ناکام صوبے کی رگِ حیات سے زندگی نچوڑ لیتا ہے اور طاقت کے خلاف تحفظ کے حصول بغیر کے غریب کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ یا تو وہ کمزور رہیں یا نقل مکانی کر کے مضبوط کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ وہ خود موثر اپنی مدد نہیں کر سکتے۔

بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ایک اہم مسئلہ آبادی کی جغرافیائی تقسیم یا دوسرے لفظوں میں ''علاقائیت'' کا ہے۔ یہاں اس سے مراد کسی ملک کے تمام علاقوں کی ترقی ہے۔تمام بڑے ممالک میں یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔آج بہت سی چھوٹی اقوام کی قوم پرستی، خود اختیاری اور نام نہاد آزادی کی خواہش دراصل علاقائی معیشت کے تقاضوں کا منطقی شاخسانہ ہے۔ پس ماندہ ممالک کے غریب عوام کے حالات علاقائی معیشت کی ترقی واستحکام کے بغیر درست ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ ترقی بڑے شہروں سے دور تمام دیہی علاقوں پر مشتمل ان علاقوں میں ہونی چاہیے جہاں لوگ آباد ہوں۔

اگر اس قسم کی کوئی کوشش نہ ہو تو عوام دو باتوں میں سے محض ایک کا انتخاب کر سکتے ہیں: یا تو وہ اپنے افلاس سے سمجھوتہ کر لیں یا پھر بڑے بڑے شہروں کی طرف ہجرت کر جائیں جہاں مزید بدحالی ان کا خیر مقدم کرے گی۔ عجیب وغریب بات یہ ہے کہ آج کی روایتی اقتصادیات مفلس عوام کے حالات بہتر بنانے کے لیے کوئی اقدام نہیں کر سکتی۔

یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ محض وہی اقتصادی پالیسیاں بہتر سمجھی جاتی ہیں جو اُمراء اور صاحبانِ اقتدار کو زیادہ امیر اور زیادہ مقتدر بنا دیں۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صنعتی ترقیاتی نظام محض بڑے شہروں سے متصل ہی کارآمد ہو سکتا ہے دیہی علاقوں میں نہیں۔اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ بڑے منصوبے چھوٹے منصوبوں کے مقابلے میں عام طور پر قابل ترجیح ہوتے ہیں نیز یہ

کہ زیادہ سرمایہ کاری کے منصوبے زیادہ مزدوروں کی کھپت والے منصوبوں کے مقابلے میں زیادہ نفع بخش ثابت ہوتے ہیں۔ اقتصادی اعداد وشمار کے مطابق سرمایہ دار مشینوں کے مقابلے میں انسانی عنصر کو کم سے کم اہمیت دیتے ہیں اس لیے کہ مشینیں غلطیاں نہیں کرتیں اور انسان غلطیوں کا پتلا ہے۔ اس طرح وہ روایتی عقل، جسے آج ہم اقتصادیات کا نام دیتے ہیں، غریب عوام سے درگزر کرتی ہے جس کے لیے ہی فی الاصل ترقیاتی منصوبہ بندی ہونی چاہیے۔ آج ہمیں عام پیداوار سے زیادہ عوام کے ذریعے پیداوار کی ضرورت ہے۔

MashalBooks.com

عظیم وسیلہ ـــــــ تعلیم

دنیا میں ہر مقام پر اور تاریخ کے ہر دور میں انسانوں نے بڑے بڑے تمدن قائم کیے، تہذیبوں کو پیدا کیا۔ تہذیب و تمدن کو خاطر خواہ ترقی ہوئی، بہت سے تمدن برباد بھی ہو گئے مگر انہیں کی خاک سے نئے تمدنوں نے سر اُٹھایا۔ محض مادی وسائل کی کمی کے باعث تمدن برباد ہوتے تو ان کی جگہ دوسرے تمدن کیسے پیدا ہوتے؟

ساری تاریخ اور ہمارا آج کا تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ بنیادی وسیلہ فطرت نہیں انسان ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ساری معاشی ترقی کا بنیادی عنصر انسان کا ذہن ہے۔ صلاحیت کار، قوتِ ایجاد، تعمیری کارکردگی یہ سب یک بیک پھوٹ پڑتی ہیں اور وہ بھی محض کسی خاص شعبہ زندگی میں نہیں بلکہ مختلف شعبوں۔ میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ تخلیقی قوتیں کیسے نمودار ہوئیں لیکن ہم اس بات کا مشاہدہ ضرور کر سکتے ہیں کہ انہیں کیسے برقرار اور مستحکم کیا جاتا ہے۔ استحکام اور استقرارِ قوت کا یہ عمل بذریعہ تعلیم ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم تمام وسائل میں سب سے زیادہ توانائی بخش وسیلہ ہے۔

اگر آج مغربی تمدن مستقل بحران کا شکار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے تعلیمی نظام میں کوئی خرابی ضرور ہے۔ اب سے پہلے کسی تمدن نے اتنی توانائی اور اتنے وسائل نظام تعلیم کو مستحکم کرنے میں صرف نہیں کیے۔ آج اس بات پر تو ہمارا پختہ ایمان ہے کہ تعلیم ہی ہر مسئلے کا حل ہے۔ اگر آج ایٹمی دور میں نئے خطرات پیدا ہو رہے ہیں، اگر جنیٹک انجینئرنگ نے نئی خرابیوں کو جنم دیا ہے اور اگر آج کے تاجرانہ ماحول میں حرص ہوس کے نئے انداز بروئے کار آ رہے ہیں تو ان سارے مسائل کا ایک ہی جواب ہے۔ بہتر تعلیم!

ریڈ لیکچروں کے دوران میں لارڈ سنو نے یہ بیان دیا تھا کہ ''یہ کہنا کہ یا تو ہم خود کو بہتر تعلیم دیں یا برباد ہو جائیں موجودہ حقائق کے عین مطابق ہے۔ یہ کہنا تو صحیح ہے کہ یا تو ہم خود کو تعلیم دیں یا پھر اپنی ہی زندگی میں تیز تر زوال کا مشاہدہ کریں۔'' لارڈ سنو نے یہ بھی بتایا کہ روسی ہمارے مقابلے میں یہ کام زیادہ بہتر طور پر سرانجام دے رہے ہیں اور وہ ہم پر بہت جلد برتری حاصل کر لیں گے۔ ان پر فوقیت حاصل کرنے کے لیے ہمیں اور امریکہ دونوں کو زیادہ ذہانت اور

تخیل کا استعمال کرتے ہوئے خود کو بہتر تعلیم دینا ہوگی۔

''سائنسی انقلاب اور دو تہذیبوں'' کے ذیل میں لارڈ سنو کا بیان یہ تھا کہ سارے مغربی معاشرے کی ذہنی زندگی تیزی سے دو قطبین کے درمیان تقسیم ہوتی جارہی ہے۔ ایک طرف تو ہمارے ادبی دانشور ہیں اور دوسری طرف سائنس دان حضرات۔ ان دونوں کے درمیان حائل خلیج جلد پاٹی جانی چاہیے۔ لارڈ سنو کے مطابق تعلیمی پالیسی کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اول تو ملک کو اعلیٰ پیمانے کے سائنس دان کثیر تعداد میں پیدا کرنے چاہییں، پھر ان سے بھی زیادہ ایسے پیشہ ور دانشور جو تحقیق اور اعلیٰ طریق کار کو ترقیاتی منصوبوں کے لیے صرف کریں، پھر ہزاروں کی تعداد میں دیگر سائنس دان اور انجینئر بنائیں اور آخر میں سیاست دانوں، حاکموں بلکہ پوری قوم کو ایسی تربیت دیں کہ وہ سائنس دانوں کی باتوں کو سمجھ سکیں۔ لارڈ سنو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر عوام کو اتنی تعلیم مل جائے کہ وہ اصل انسانوں یعنی سائنس دانوں کی زبان سمجھ لیں تو ''دونوں تہذیبوں'' کے درمیان حائل خلیج پٹ جائے گی۔

اس قسم کے خیالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عوام الناس، جن میں سیاست دان اور احکام دونوں شامل ہیں، زیادہ کارآمد نہیں ہیں۔ ایسی باتوں سے ایک غیر تسلی بخش احساس یوں پیدا ہوتا ہے کہ سائنس دان تو ہمیں یہ بتاتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے کہ ان کی محنت کا پھل ''غیر جانبدار'' ہے۔ اس سے انسانیت کو فروغ ہوگا یا وہ تباہ ہو جائے گی، یہ بات اس کے طریق استعمال پر منحصر ہے۔ اب یہ فیصلہ کون کرے گا کہ اُسے کیسے استعمال کرنا چاہیے؟ سائنس دانوں اور انجینئروں کو تو اس سلسلے میں کوئی تعلیم نہیں دی جاتی، پھر سائنس غیر جانبدار کیسے رہے گی؟

اگر آج تعلیم پر یہ انحصار کیا جارہا ہے کہ وہ لوگوں کو اس قابل بنائے کہ یہ لوگ سائنس اور صنعتی ترقی سے پیدا ہونے والے مسائل سے عہدہ برا ہو سکیں تو پھر تعلیم کو لارڈ سنو کے مشوروں سے کچھ زیادہ ہی کام سرانجام دینا ہوگا۔ سائنسداں اور انجینئر تو ''طریق کار'' بتاتے ہیں لیکن ''طریق کار'' کو تہذیب سمجھنا ایسی ہی ہے جیسے پیانو کو موسیقی سمجھ لیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا تعلیم صلاحیت کار کو انسانوں کے لیے مفید حقیقت میں بدل سکتی ہے؟

اس کام کے لیے تعلیم کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ انسانی زندگی کی فلاح کے متعلق قابل قدر تصورات کو پھیلائے۔ طریق کار کی بھی اہمیت ہے مگر ثانوی۔ اس لیے کہ یہ بات احمقانہ ہوگی کہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں وہ آلات دے دیے جائیں جن کے بارے میں وہ یہ جانتے ہی

نہیں کہ ان سے کیا کرنا ہے۔ آج بلاشبہ ساری انسانیت فنا کے دروازے پر ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہمارے پاس سائنسی اور ٹکنیکی طریق کار کی کمی ہے بلکہ اس لیے کہ ہم اسے بلا سوچے سمجھے تباہ کن مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی طرف مائل ہیں۔

تعلیم کا جوہر، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، اقدار کی فراہمی ہے تاہم اقدار اس وقت تک ہمیں صحیح راہ نہیں دکھا سکتیں جب تک ہم انہیں اپنا نہ لیں، جب تک کہ وہ ہماری وصیت کا حصہ نہ بن جائیں۔ وہ نہ تو فارمولا ہوتی ہیں اور نہ تعصّبات۔ ان کے ذریعے ہمیں سوچنا اور محسوس کرنا چاہیے، ان کے ذریعے ہمیں دنیا کو دیکھنا، اس کی تفسیر اور اس کا مشاہدہ کرنا چاہیے۔ جب ہم سوچتے ہیں تو محض سوچتے ہیں، ہم تصورات و خیالات کے ذریعے سوچتے ہیں۔ ہمارا ذہن شفاف سلیٹ نہیں ہوتا۔ سوچنے کا مطلب یہ ہے کہ ذہن میں پہلے سے خیالات بھرے ہوتے ہیں جن کی مدد سے ہم سوچتے ہیں۔ بچپن سے ہی لاتعداد خیالات ہمارے ذہن میں بھرتے رہتے ہیں۔ بڑے ہو کر ہم میں وہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ ہم خیالات کی اس وراثت میں امتیاز و انتخاب کا عمل جاری کر سکیں۔

سب سے پہلی چیز تو زبان ہے جس کا ہر لفظ ایک خیال ہے۔ اگر بچپن کی زبان انگریزی ہے تو ہمارے ذہن میں ایسے خیالات ہوں گے جو دوسری زبانوں مثلاً چینی، روسی، جرمن یا امریکن خیالات سے مختلف ہوں گے۔ الفاظ کے بعد جملوں میں اُن کی ترتیب آتی ہے۔ مسائل صرف و نحو، تصورات کا ایک الگ مجموعہ ہیں۔ ان کے مطالعے نے بعض جدید فلسفیوں کو اتنا مسحور کیا ہے کہ وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ سارے فلسفوں کا نچوڑ علم صرف و نحو میں آ سکتا ہے۔

جدید عہد میں ہم خیالات کے مطالعے پر زور نہیں دیتے جو تمام تر تصورات و مشاہدات کے لیے آلہ کار ہوتے ہیں۔ شعور اور تجربے کی بنیاد پر معمولی خیالات کو تو یقیناً رد کیا جا سکتا ہے لیکن جہاں تک بڑے خیالات اور لطیف تصورات کا تعلق ہے انہیں تبدیل کرنا اتنا آسان نہیں۔ دراصل ان کا ادراک اس لیے بھی مشکل ہوتا ہے کہ وہ ہماری فکر کے لیے آلۂ کار ہوتے ہیں، فکر کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ آپ اپنی آنکھوں سے باہر کی ہر شے دیکھ سکتے ہیں لیکن خود آنکھوں کو نہیں دیکھ سکتے جن کی مدد سے ہر شے دیکھی جاتی ہے۔ اگر آپ ان خیالات کا ادراک کر بھی لیں تو بھی اپنے معمولی تجربات کی بنا ان پر محاکمہ نہیں دے سکتے۔

ہم دوسرے لوگوں کے ذہنوں میں بعض بندھے ٹکے خیالات پاتے ہیں جن کی مدد سے وہ

غور وفکر کرتے ہیں گو انہیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ ہم انہیں تعصّبات کا نام دیتے ہیں۔ شاید یہ صحیح ہے کیونکہ ایسے خیالات غور وفکر کا نتیجہ نہیں ہوتے تعصّبات متعصب آدمی کے علاوہ ہر سمجھدار شخص کو بالعموم غلط معلوم ہوتے ہیں۔ وہ خیالات، جو لفظوں اور قواعد کی شکل میں رونما ہوتے ہیں، اُن پر صداقت یا غلطی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ بہت سے خیالات یقیناً غور وفکر کا نتیجہ ہوتے ہیں اس لیے انہیں تعصب کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

لہٰذا ہمارا دعا یہ ہے کہ ہم اپنے خیالات کی مدد سے سوچتے ہیں اور اپنے ذہن میں موجود خیالات کو کسی صورتِ حال یا امر واقعہ پر منطبق کر دیتے ہیں۔ بعض خیالات قدروں سے متعلق ہوتے ہیں۔ یوں ہم اپنے نظام اقدار کے حوالے سے کسی صورت حال کا قدری جائزہ لیتے ہیں۔

ہمارے ذہنی تصورات دنیا کے تجربے اور اس کی تفہیم کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ اب اگر ہمارے تصورات فضول، کمزور سطحی اور نامناسب ہیں تو زندگی بھی ہمارے لیے فضول، بے معنی، حقیر اور بے ہنگم ہوگی۔ خلاء کے اس احساس کو برداشت کرنا بہت مشکل ہے لہٰذا ہمارے خالی ذہن میں بہ آسانی کوئی بڑا واہمہ بھر جائے گا خواہ اس کی نوعیت سیاسی ہو یا کچھ اور۔ یہ واہمہ ہر شے کو روشن کر دے گا اور ہمارے وجود میں معنی اور مقصد نظر آنے لگے گا۔ یہاں اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ یہی ہمارے عہد کا سب سے بڑا خطرہ ہے۔

جب لوگ تعلیم کی بات کرتے ہیں تو ان کا مطلب تربیت، واقعاتی حقائق کے علم اور تفریحات سے کچھ زیادہ ہوتا ہے خواہ وہ یہ نہ سمجھتے ہوں مگر وہ ایسے خیالات کے متلاشی ہوتے ہیں جو ان کی زندگی اور دنیا کو اُن کے لیے قابل فہم بنا دے۔ چیزوں کی تفہیم ہی ہمیں ان سے متعلق کرتی ہے۔ تفہیم کی کمی لاتعلقی پیدا کرتی ہے۔ اگر ذہن میں توانا خیالات کے اوزار نہ ہوں تو ساری دنیا بد نظمی، انتشار اور لایعنی واقعات کا مجموعہ نظر آئے گی۔ ایسا شخص اجنبی اور غیر متمدن سر زمین کا باسی معلوم ہوگا۔ اس کے پاس نہ کوئی نقشہ ہوگا، نہ سنگ میل اور نہ کوئی سمت نہ کسی چیز کا کوئی مفہوم ہوگا اور نہ کوئی خاص دلچسپی _____

سارے رایتی فلسفے کی غایت یہ ہے کہ وہ ایک ایسا نظام تصورات قائم کرے جس کے حوالے سے زندگی اور کائنات کی تفہیم ہو سکے۔ پروفیسر کون کے بقول ''یونانیوں کے نزدیک فلسفہ انسانی ذہن کے نظام حیات کی تفہیم کی ایسی واحد کاوش ہے جو انسان کو ایک ایسے مکمل نظام سے ہم آہنگ کر دے جس میں خود اس کا ایک متعین مقام ہو''۔ کلاسیکی عیسائی تہذیب میں بھی

کائنات میں انسان کا ایک متعین منصب تھا۔ جب یہ نظام بکھر گیا تو اس کا نتیجہ انسانی حیرت اور لاتعلقی میں ظاہر ہوا جسے کرکے گور نے پچھلی صدی کے نصف آخر میں اس طرح بیان کیا ہے:

''آدمی زمین میں انگلی گاڑ کر اس کی مہک سے یہ بتا سکتا ہے کہ وہ کس سرزمین پر ہے۔ میں وجود میں اپنی انگلی گاڑتا ہوں۔ اس میں کوئی مہک نہیں ہے۔ میں کہاں ہوں؟ میں کون ہوں؟ میں یہاں کیسے آیا؟ یہ کیا چیز ہے جسے دنیا کہتے ہیں؟ اس دُنیا کے معنی کیا ہیں؟ وہ کون ہے جس نے بہلا کر مجھے یہاں پہنچایا اور اب مجھے یہاں چھوڑ گیا؟ ..... میں اس دُنیا میں کیسے آیا؟ مجھ سے مشورہ کیوں نہیں کیا گیا ..... مجھے یہاں اس طرح گھسیڑ دیا گیا گویا کسی اغوا کنندہ سے خریدا گیا ہو، اس سے جو روحوں کی تجارت کرتا ہو، مجھے ان بڑی کارگزاریوں میں کیسے دلچسپی ہوئی جسے حقیقت کہتے ہیں؟ مجھے اس سے دلچسپی کیوں ہو؟ کیا یہ اپنی مرضی کا معاملہ نہیں ہے؟ اور اگر مجھے مجبوراً اس میں حصہ لینا ہے تو پھر ہدایت کار کہاں ہے؟ ..... میں اپنی شکایت لے کر کس کے پاس جاؤں؟''۔

شاید ہدایت کار کوئی نہیں ہے۔ برٹرینڈ رسل نے تو بتا دیا ہے کہ ساری دنیا ''ذرات کے اتفاقی اجتماعات'' کا نتیجہ ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ وہ نظریات، جو اس نتیجے تک لے جاتے ہیں، ''اگر مکمل طور پر ناقابل تردید نہیں تو بھی یقین سے اتنے قریب ہیں کہ کوئی فلسفہ ان کی تردید کرتے ہوئے خود قابل اعتنا نہیں ہو سکتا ..... بے لچک ناامیدی کی بنیاد پر ہی روح کی عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔''

لاتعلقی سے تنہائی اور ہراس پیدا ہوتا ہے اور پھر ''لاشے سے نبرد آزمائی''۔

کلبیت اور سرکشی کے بے بنیاد رویّے، جن کا اظہار تمام تر وجودی فلسفوں اور جدید ادب میں عام ہے۔ آخر اس لاتعلقی کا سبب کیا ہے؟ آج سے پہلے سائنس اتنی زیادہ فتح مند کبھی نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی انسان نے اپنے ماحول پر اتنا عبور حاصل کیا تھا اور نہ اتنی تیزی سے ترقی کی تھی۔ محض ''طریق کار'' کی کمی کر کے گور جیسے مفکر اور برٹرینڈ رسل اور ہوائل جیسے ریاضی دانوں میں اتنا شدید ہراس پیدا نہیں کر سکتی۔ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ بہت سے کام کیسے کرنے چاہییں مگر ہم یہ نہیں جانتے کہ کیا کرنا چاہیے۔ آرتیگا وائی گیسے نے واضح طور پر اس جانب اشارہ کیا ہے: ''ہم بغیر تصورات کے انسانی سطح پر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اُن پر ہمارے عمل کا انحصار ہے زندگی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ایک کام کے بجائے دوسرا کام کیا جائے''۔ پھر تعلیم کیا ہے؟ تعلیم ایسے خیالات کی

ترویج ہے جن کی مدد سے انسان دو مختلف باتوں میں امتیاز کر سکتا ہے یا بقول آرنیگا ''ایسی زندگی بسر کر سکتا ہے جو لایعنی المیے یا باطنی احساسِ ذلت سے بالاتر ہو''۔

ایسی صورت حال میں تھرموڈائنمکس کا دوسرا قانون جاننا ہمارے کس کام آسکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے پاس خیالات کے اوزار کا ڈبہ ہو جس کو کام میں لاتے ہوئے ہم زندگی کا تجربہ اور اس کی تشریح کر سکیں۔ اگر ہم نے تھرموڈائنمکس کے دوسرے قانون کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا تو ہمارا کیا جائے گا لیکن اگر ہم شیکسپیر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو ہم زندگی سے بے بہرہ ہو جائیں گے۔

سائنس وہ خیالات پیدا نہیں کر سکتی جو ہمیں زندگی کرنے میں مدد دیں۔ اُس کے بڑے سے بڑے خیالات محض ومفروضے ہوتے ہیں جن سے ایک مخصوص تحقیقی کام تو لیا جا سکتا ہے لیکن جو زندگی گزارنے یا دنیا کی تشریح وتفسیر کے لیے بیکار ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اس لیے تعلیم حاصل کرتا ہے کہ وہ لاتعلقی اور ہراس کا شکار ہے اور اُس کی زندگی میں لایعنیت اور خلا ہے تو وہ کسی طبعی سائنس کو پڑھ کر مراد حاصل نہیں کر سکتا۔ سائنس کے مطالعے کی اپنی قدر ہے۔ اس کے پڑھنے والے کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فطرت میں اشیا کس طرح کار بند ہوتی ہیں لیکن یہ زندگی کے معانی کے متعلق کچھ نہیں بتاتی۔ نہ ہی اس کے پاس لاتعلقی اور پوشیدہ ہراس کا کوئی علاج ہے۔

تو پھر ایسے شخص کو کیا کرنا چاہیے؟ ہوسکتا ہے کہ وہ اس سائنسی انقلاب کی دنیا سے نامرنہاد علوم انسانی کی طرف مُڑ جائے۔ البتہ یہاں اسے عظیم وتوانا تصورات سے سابقہ پڑے گا جن کے ذریعے وہ سوچ سکتا ہے اور دنیا، معاشرے اور خود اپنی زندگی کو مفہوم عطا کر سکتا ہے۔ ایسے تمام تصورات کی مکمل فہرست تیار کرنا تو مقصود نہیں لیکن چھ رہنما تصورات کا ذکر ہوسکتا ہے انہوں نے انیسویں صدی میں جڑیں پکڑیں اور جو آج بھی تعلیم یافتہ ذہنوں پر حاوی ہیں:

۱۔ ارتقاء کا تصور۔ زندگی کی ادنیٰ صورتیں اعلیٰ صورتوں کی جانب مسلسل، فطری اور خودکار انداز میں ارتقاء پذیر ہیں۔ پچھلے سوا سو سال سے حقیقت کے ہر پہلو پر، بلا کسی استثنیٰ کے، اس تصور کا اطلاق ہو رہا ہے۔

۲۔ مسابقت، فطری انتخاب اور جہد للبقا کے تصورات۔ ان تصورات کے ذریعے ارتقاء اور ترقیوں کے فطری اور خودکار عمل کی وضاحت ہوتی ہے۔

۳۔ یہ تصور کہ انسانی زندگی کے تمام تر اعلیٰ اظہار مثلاً مذہب، فلسفے، فنون لطیفہ وغیرہ، جنہیں

مارکس نے ''انسانی ذہن کے توہمات'' سے تعبیر کیا ہے،''مادی زندگی گزارنے کے لیے ضروری ضمنیات'' سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ دراصل معاشی مفادات کی پردہ پوشی کے لیے بالائی ڈھانچا ہیں۔انسانیت کی پوری تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے۔

۴۔ انسانی زندگی کے اعلیٰ اظہار کی بابت مارکسی تشریحات کے مقابلے میں یہ چوتھا تصور فرائڈ کا ہے۔اس تصور کے مطابق یہ تمام چیزیں تحت الشعور کے تاریک محرکات کا شاخسانہ اور بچپن اور قابل از بلوغت کی غیر آسودہ جنسی خواہشات کا نتیجہ ہیں۔

۵۔ ایک عام تصور اضافیت کا ہے جس کے مطابق کسی مطلق قدر کا وجود ہی نہیں۔ نہ کوئی عمومی معیار ہے۔صداقت کے تصور کی مکمل نفی کرتے ہوئے یہ محض عملی اور تجرباتی حقائق کو ہی تسلیم کرتی ہے۔اس کے اثرات ریاضی پر بھی ہیں جو بقول برٹرینڈ رسل ''ایسا مضمون ہے جس کے بارے میں ہم یہ کبھی نہیں جانتے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں یا یہ کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ سچ بھی ہے۔''

۶۔ سب سے آخر میں فاتح تصور ''اثباتیت'' ہے جس کا ادعا یہ ہے کہ صداقت محض سائنسی طریق کار ہی کا نتیجہ ہوسکتی ہے لہٰذا کوئی علم بھی اس وقت تک صحیح نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی بنیاد قابل مشاہدہ حقائق پر نہ ہو۔دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اثباتیت محض طریق کار کی قائل ہے اور کسی مفہوم یا مقصد کے معروضی علم کے امکان سے منکر ہے۔

مندرجہ بالا چھ عظیم تصورات کی قوت اور گیرائی سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ان کی صحت کے بارے میں کوئی واقعاتی چھان بین نہیں کی گئی۔ یہ نامعلوم کی دنیا میں تخیل کی ایک بڑی جست کا نتیجہ ہیں۔ ہاں یہ کہ یہ جست حقائق کے مشاہدے کے چھوٹے سے تختے سے لگائی گئی۔ان تصورات میں کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہے ورنہ وہ اتنے بڑے پیمانے پر انسانی ذہن کو گرفت میں نہ لے سکتے۔تاہم مشکل یہ ہے کہ انہیں آفاقی قوانین کا درجہ حاصل ہے۔ یہ کسی حد بندی کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ تمام کائنات اور عالم انسانی کے لئے مطلق قوانین ہونے کے دعویدار ہیں۔

ان تمام تصورات میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان کے نزدیک وہ سب کچھ، جسے پہلے اعلیٰ درجات پر فائز سمجھا جاتا تھا، محض نچلی سطح زندگی کا اظہار ہیں لہٰذا آدمی دنیا کی ہر دوسری شے کی

طرح محض ذرات کا اتفاقی مجموعہ ہے۔ آدمی اور پتھر میں امتیاز قائم کرنا محض واہمہ ہے۔ آدمی کے اعلیٰ ترین تہذیبی عوامل یا تو پوشیدہ معاشی حرص کا نتیجہ ہیں یا پھر نا آسودہ جنسی خواہشات کا اظہار۔ بہرصورت یہ کہنا بے معنی ہے کہ آدمی کو ''ادنیٰ'' کے بجائے ''اعلیٰ'' پر نظر رکھنی چاہیے جیسے موضوعی تصورات کو کوئی قابل فہم معنی دیے ہی نہیں جاسکتے اور یہاں تک لفظ ''چاہیے'' کا تعلق ہے یہ عظمت کے واہمے کا حاکمانہ اظہار ہے۔

انیسویں صدی والوں کے حوالے سے تو یہ تصورات ان کے ذہنی عوامل کا حاصل تھے لیکن چند نسلوں کے بعد بیسویں صدی میں انہوں نے آلات کی شکل اختیار کر لی جن سے دنیا کا تجربہ اور اس کی تشریح ہونے لگی۔ آج مغربی دنیا کے ہر فرد کے ذہن میں انیسویں صدی کے ان خیالات کی گرفت مضبوط ہے خواہ وہ تعلیم یافتہ ہے یا ان پڑھ۔ البتہ تعلیم سے محروم لوگوں میں یہ کمزور اور گڈمڈ ہیں جس کی وجہ سے انہیں دنیا کی واضح تفہیم نہیں ہے۔ لہٰذا تعلیم کی ضرورت کا احساس شدید ہے تاکہ وہ گڈمڈ تصورات کے تاریک جنگل سے نکل کر تفہیم کی روشنی میں واپس آسکیں۔

یہ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ محض سائنس کی تعلیم یہ فریضہ سرانجام نہیں دے سکتی۔ اس لیے کہ وہ ہمیں محض ''طریق کار'' بتا سکتی یہ جب کہ ہم جاننا یہ چاہتے ہیں کہ چیزیں ایسی کیوں ہیں جیسی وہ ہیں اور ہم اپنی زندگیوں کے ساتھ کیا کریں؟ سائنس تو ہمیں محدود پیمانے پر مخصوص باتیں بتاتی ہے اور ہمارے مقاصد وسیع ہیں لہٰذا ہمیں انسانی علوم سے رجوع کرنا پڑتا ہے تاکہ اپنے دور کے عظیم و توانا خیالات سے وضاحتیں حاصل کرسکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس منطقے میں بھی تخصیصی امور بہت ہیں اور بہت سے ادنیٰ خیالات ہیں جو ہمارے مقاصد کے لیے اتنے ہی فضول ہیں جتنے کہ طبعی سائنسوں کے تصورات۔ البتہ اگر قسمت ساتھ دے تو کوئی استاد ایسا ضرور مل سکتا ہے جو ہمارے اذہان کو صاف کردے اور ان عظیم اور آفاقی تصورات کو، جو پہلے سے ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں، واضح کردے اور اس طرح دنیا کو قابل فہم بنادے۔ ہم اس عمل کو تعلیم کہہ سکتے ہیں۔

لیکن آج تعلیم ہمیں دے کیا رہی ہے؟ دنیا کا ایک ایسا تصور جو اسے ''بنجر سرزمین'' بتاتا ہے، جس کا کوئی مفہوم یا مقصد نہیں ہے، جس میں انسانی شعور بدقسمت کو نیاتی حادثہ ہے اور جو محض ہراس اور اس نا امیدی جیسے حقائق کی آماجگاہ ہے۔ اب اگر صحیح تعلیم کے ذریعے آدمی بقول

آر یگا ''عہد کے خیالات کی بلندیوں تک'' پہنچ جائے تو وہ خود کو ''لا'' کی کھائی میں پاتا ہے۔ لہٰذا مروجہ تعلیم کا حاصل کچھ بھی نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر کیا ہوا ہے؟ ہوا یہ ہے کہ انیسویں صدی کے ایسے تصورات، جنہوں نے مابعد الطبیعات کو مسترد کر دیا، بذات خود ایک قسم کی قنیج اور زندگی کو برباد کر دینے والی مابعد الطبیعات ہیں جو ہمیں موت سے ہمکنار کرنے والی بیماریوں کی طرح لاحق ہو گئے ہیں۔ غلطی سائنس میں نہیں ہے اس فلسفے میں ہے جو ہمارے سامنے سائنس کی صورت میں آیا ہے۔ ایتیمین گلسن سے سنیے:

سائنس کے علمی نتائج میں لوگوں کی دلچسپی فطری تھی اور جائز بھی لیکن وہ یہ بھول گئے کہ سائنس علم ہے اور عملی نتائج اس کا ثمر.....لوگوں نے ان تمام علوم کو حقارت سے دیکھنا شروع کیا جن میں ایسے نتائج کی گنجائش نہیں تھی یا پھر ان علوم کو طبعی سائنسوں کے نمونے پر ڈھالنا شروع کیا۔ نتیجے کے طور پر یا تو مابعد الطبیعات اور اخلاقیات کو درخور اعتنا نہ سمجھا یا کم از کم ان کی جگہ نئی اثباتی سائنسوں نے لے لی۔ دونوں صورتوں میں وہ ختم ہو جائیں گی۔ یہ انتہائی خطرناک صورت حال ہے کہ یہی بنیاد ہے اس خطرے کی جس میں مغربی تہذیب اس وقت گھری ہوئی ہے۔

تاہم یہ بھی صحیح نہیں کہ مابعد الطبیعات اور اخلاقیات ختم ہو جائیں گی۔ اس کے برعکس ہمیں جو کچھ ملا ہے، وہ قنیج مابعد الطبیعات اور مکروہ اخلاقیات ہے۔

تعلیم اس وقت تک ہماری مدد نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ مابعد الطبیعات کو اہمیت نہ دے۔ پڑھائے جانے والے مضامین سائنسی ہوں یا انسانی علوم سے متعلق جب تک تدریس مابعد الطبیعات کی وضاحت نہیں کرتی یعنی ہمارے بنیادی عقائد کی، یہ کسی شخص کو علم نہیں دے سکتی اور نتیجتاً معاشرے کے لیے قابل قدر نہیں ہو سکتی۔

کہا جاتا ہے کہ تخصیص کے باعث تعلیمی نظام تباہ ہو رہا ہے لیکن یہ سطحی اور غلط تشخیص ہے۔ کنفیوشس نے کہا تھا کہ ''میں تمہیں بتاؤں علم کا مفہوم کیا ہے؟ جب تم کسی چیز کو اس طرح جانو کہ تمہیں معلوم ہو کہ تم جانتے ہو اور اگر نہیں جانتے تو یہ معلوم ہو کہ تم نہیں جانتے ___ یہی علم ہے''۔ غلطی تخصیص میں نہیں اس سطحیت میں ہے جس کے ساتھ کسی مضمون کی تدریس ہوتی ہے اور مابعد الطبیعیاتی شعور کی غیر موجودگی میں ہے۔ آج سائنس کی تدریس اُس کے بنیادی مفروضوں کے شعور کے بغیر ہو رہی ہے۔ سائنسی قوانین کے مفہوم اور ان کی اہمیت اور انسانی خیالات کی تعلیم

کائنات میں انسان کے مقام کے تعین کے بغیر ہو رہی ہے۔ اقتصادیات کی تعلیم تو ہو رہی ہے لیکن جدید اقتصادی نظریات کی تہہ میں انسانی فطرت کے جو تصورات ہیں اُن کا کوئی احساس نہیں دلایا جاتا۔ بہت سے ماہرین اقتصادیات تو خود بھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ ان کی تدریس میں ایسے تصورات مضمر ہوتے ہیں کہ اگر یہ تصورات تبدیل ہو جائیں تو اُن کے تقریباً تمام نظریات خود بخود بدل جائیں گے۔ انسانی فطرت کا تصور ہر مضمون میں مضمر ہوتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو کوئی مضمون انسانی علوم کی ذیل میں آ ہی نہیں سکتا۔

تعلیم محض اس وقت ہماری مدد کر سکتی ہے جب وہ ''بھرپور آدمی'' پیدا کرے۔ صحیح تعلیم یافتہ شخص وہ نہیں ہے جسے ہر شے کا تھوڑا تھوڑا علم ہو نہ ہی وہ ہے جو تمام موضوعات کے بارے میں تمام تفاصیل سے واقف ہو (بشرطیکہ ایسا ممکن ہو)۔ ''بھرپور آدمی'' کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ حقائق اور نظریات کی بہت کم تفاصیل سے واقف ہو۔ اس کے لیے تو انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا رکھ سکتا ہے جس میں وہ سب کچھ درج ہے جو اُسے نہیں معلوم۔ تاہم اُس کا حقیقی تعلق مرکز سے ہوتا ہے۔ اسے اپنے بنیادی ایقان پر، زندگی کے معنی اور مقاصد کے متعلق اپنے تصورات پر کبھی شک نہیں ہوتا، خواہ وہ ان باتوں کو لفظوں میں بیان نہ کر سکے تاہم اس کی پوری زندگی اُس یقین کا مظہر ہوگی جو اس کے واضح باطن سے پھوٹتا ہے۔

آدمی کا ''مرکز'' وہ مقام ہے جہاں وہ اپنے اور دنیا کے بارے میں خیالات کا ایک نظام قائم کرتا ہے۔ یہی نظام اس کے مختلف محرکات کی سمت متعین کرتا ہے۔ اگر وہ یہ نہیں کرتا تو ''مرکز'' بہرحال خالی نہیں رہے گا۔ خانہ خالی را دیو می گیرد۔ آج اس ''مرکز'' میں جن توانا تصورات کا وجود نظر آتا ہے وہ منفی ہیں، مثلاً اس سرزمین پر انسانی وجود کے معنی اور مقاصد سے مکمل انکار۔ نتیجتاً ان لوگوں کی مکمل مایوسی جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔ ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہمارا دل ذہن سے زیادہ ذہین ہوتا ہے اور وہ ایسے خیالات کو مکمل طور پر ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح آدمی مایوسی سے تو بچ جاتا ہے مگر ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایقان میں انتشار ہو تو عمل میں انتشار لازمی ہے۔ مگر عقل و شعور کی روشنی سے اپنے ''مرکز'' کو روشن کر کے آدمی انتشار کو نظم و ضبط میں بدل سکتا ہے۔ اصل تعلیم یہی ہے کہ کسی شخص کو مابعد الطبیعیاتی انتشار کے اندھیروں سے نکال کر روشنی کے راستے پر ڈال دیا جائے۔

انیسویں صدی کے تصورات کائنات کے ''درجات وجود'' سے منکر ہیں۔ ''درجاتِ وجود''

یا ''مدارج حیثیت اشیا'' کو سمجھے بغیر نہ تو ہم دنیا کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ کائنات کی سکیم میں انسانی وجود کی حیثیت کو۔ کائنات میں درجات کے زینے کو دیکھ کر ہی ہمیں انسانی زندگی کا مقصد اور اس کے مفہوم کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ انسان کا بنیادی کام یا اس کے لیے مسرت کا حصول اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اپنے امکانات کی اعلیٰ سطحوں کو حاصل کرنے کی سعی کرے۔ ادنیٰ فطری سطح سے بلند تر ہو کر اعلیٰ سطح تک پہنچنا، وجود کا اعلیٰ تر درجہ حاصل کرنا ہی مقصود حیات ہے۔ انیسویں صدی کے تصورات کی مدد سے ہم درجات وجود کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

اگر ہم درجاتِ وجود کو تسلیم کرلیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ طبعی سائنسوں کے طریق کار کو سیاسیات یا اقتصادیات پر کیوں منطبق نہیں کیا جاسکتا نیز یہ کہ طبعیات کے پیدا کردہ نتائج: جیسا کہ خود آئن سٹائن نے تسلیم کیا، فلسفیانہ مضمرات کیوں نہیں؟

ہم بات اس بات کا بہ آسانی مشاہدہ کرسکتے ہیں کہ زندگی میں ہمیں بعض ایسے تضادات کو حل کرنا پڑتا ہے جنہیں منطقی طور پر حل نہیں کیا جاسکتا۔ ہم بالعموم جس سطح پر زندگی گزارتے ہیں اس پر تو یہ ناممکن ہے، مثلاً تعلیم میں آزادی اور نظم وضبط کے تقاضوں کو بھلا کیسے مربوط اور حل کرسکتے ہیں؟ تاہم لاتعداد مائیں اور اساتذہ یہ کام سرانجام دیتے ہیں البتہ وہ اپنے حل کو ضبط تحریر میں نہیں لاسکتے۔ وہ اپنی خاص صورتحال میں ایک ایسی قوت کو کام میں لاتے ہیں جس کا تعلق زندگی کی اس اعلیٰ تر سطح سے ہے جہاں تضادات حل ہو جاتے ہیں ___ وہ محبت کی قوت ہے!

جی۔ این۔ ایم۔ ٹائریل نے دو اصطلاحیں استعمال کی ہیں: ''مرکز گریز'' اور ''مرکز گیر'' ان کی مدد سے وہ اُن مسائل کی تفہیم کرتے ہیں جنہیں منطقی طور پر حل نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی ''مرکز گریز'' مسائل سے گزرنے کا نام ہے جنہیں محض موت ہی حاصل کرسکتی ہے۔ ''مرکز گیر'' مسائل انسان کی ایجاد ہیں۔ ان کا وجود موجود حقائق میں نہیں ہوتا۔ وہ تجدید کے عمل سے پیدا کیے جاتے ہیں۔ ایسے مسائل کے حل لکھے اور دوسروں تک پہنچائے جاسکتے ہیں جو انہیں بلا کسی ذہنی تردد کے استعمال کرسکتے ہیں۔ اب اگر ان کا استعمال انسانی تعلقات کی دنیا پر کیا جائے، مثلاً خاندانی زندگی پر، اقتصادیات، سیاسیات اور تعلیم پر تو پھر تو انسانی زندگی کی جگہ میکانیکی ردعمل لے لے گا اور زندگی خود ''زندہ موت'' بن جائے گی۔ ''مرکز گریز'' مسائل انسانوں کو نچلی سطح سے بلند تر سطح تک اُٹھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ بالائی سطحوں سے وہ توانائی حاصل کرتے ہیں جس کا حاصل محبت، حسن، خیر اور صداقت ہوتا ہے۔ یہی وہ قوتیں ہیں جو تضادات کو حل کر کے زندگی بخش

صورت حال پیدا کرتی ہیں۔

اگر ہم زندگی میں محض مرکز گیر مسائل سے عہدہ برا ہوتے رہیں تو زندگی سے دور ہوتے جائیں گے۔ڈراون کی زبانی سنیے:

> تیس برس کی عمر یا اس سے کچھ عرصہ بعد تک مختلف اقسام کی شاعری..... میرے لیے انتہائی مسرت بخش ہوتی تھی۔ دوران تدریس مجھے شیکسپیئر میں شدید لذت ملتی بالخصوص تاریخی ڈراموں میں۔ میں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ پہلے تصویروں سے خاصی اور موسیقی سے انتہائی خوشی حاصل ہوتی تھی لیکن اب سالہا سال سے میں شاعری کا ایک مصرع بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ میں نے حال ہی میں شیکسپیئر کو پڑھنے کی کوشش کی اور اُسے ناقابل برداشت حد تک اتنا بیزار کن پایا کہ متلی کا احساس ہونے لگا۔موسیقی کا،تصویروں کا ذوق بھی جاتا رہا۔ میرا ذہن اب ایسی مشین بن گیا ہے جو موجود حقائق کے ڈھیر سے عمومی قوانین پیستا رہتا ہے۔لیکن ایسا کیوں ہے کہ اُس نے میرے دماغ کے اس بالائی حصے کو ہی مفلوج کیا جن پر اعلیٰ ذوق کی بنیاد ہوتی ہے؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی.....ذوق کی تباہی زندگی کی مسرتوں کی بربادی ہے۔ہوسکتا ہے کہ یہ عقل کے لیے بھی ضرر رساں ہو اور زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ ہماری فطرت کے جذباتی عنصر کو کمزور کرکے ہمارے اخلاقی کردار کے لیے مضر ثابت ہو۔

اور ڈارون نے جن خطرات کی طرف اشارہ کیا ہے آج اس کے آثار ہمارے اردگرد ہر طرف نمایاں نظر آتے ہیں۔

زندگی کے حقیقی مسائل ___ سیاست،معیشت،تعلیم اور شادی وغیرہ سے متعلق ___ ایسے مسائل ہیں جن پر تضادات کے حل سے ہی فتح حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ مسائل مرکز گریز ہوتے ہیں اس لیے ان کے حل معمولی نہیں ہوتے۔ یہ انسانوں سے محض عقلی دلائل کا تقاضا نہیں کرتے،اُن سے ان کی پوری ذات کی شمولیت چاہتے ہیں۔ چالاکی سے وضع کیے ہوئے فارمولوں سے کام نہیں چلتا۔ یہ دیرپا ہو ہی نہیں سکتے کیوں کہ یہ بالعموم دو متضاد چیزوں میں سے کسی ایک سے قطع نظر کرلیتے ہیں اسی لیے ان سے انسانی زندگی کی خاصیت غائب ہوجاتی ہے۔ مثلاً معیشت کے سلسلے میں کوئی حل آزادی تو مہیا کردے لیکن منصوبہ بندی سے قطع نظر کرلے یا پھر اس کے برعکس

کسی صنعتی ادارے میں یہ تنظیم تو پیدا کر دے مگر انتظامی امور میں مزدوروں کے عمل دخل کو قبول نہ کرے یا پھر اس کے برعکس۔ اسی طرح سیاست میں یہ جمہوریت کے بغیر رہنما یا رہنماؤں کے بغیر جمہوریت کو جنم دے سکتا ہے۔

مرکز گریز مسائل سے نبرد آزمائی پریشان کن، ہمت شکن اور تھکا دینے والی ہوتی ہے لہٰذا بالعموم لوگ اس سے کتراتے ہیں۔ وہ افسر جو دن بھر مرکز گریز مسائل سے جنگ کرتا ہے شام کو معمے حل کرتا ہے یا جاسوسی ناولوں سے جی بہلاتا ہے جن کا تعلق مرکز گیر مسائل سے ہوتا ہے اور اسی لیے ان میں دلچسپی زیادہ ہوتی ہے۔ ان میں ذہن کو بالائی سطح پر لے جا کر لاینحل تضادات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ مگر آخر الذکر ہی زندگی کا اصل مواد ہوتا ہے۔

اب ایک اور مسئلہ ہے جس کا اصل تعلق تو مابعد الطبیعات سے ہے۔ گو بالعموم اسے اخلاقیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انیسویں صدی کے تصورات وجود کی مختلف سطحوں کے منکر ہیں اور اس لیے یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ بعض چیزیں بعض دوسری چیزوں سے بلند درجے پر فائز ہوتی ہیں۔ یہی اخلاقیات کی تباہی کا سبب ہے جس کی بنیاد ہی خیر اور بدی کے امتیاز پر ہے اور جس کا دعویٰ ہے کہ خیر کا مقام بدی سے افضل ہے۔ جن لوگوں نے اول اول یہ اعلان کیا کہ ''ساری اخلاقیات فضول ہے'' اُن کے ذہنوں میں تو یقیناً بہتیرے اخلاقی تصورات بھرے ہوئے ہوں گے مگر تیسری اور چوتھی نسل کے پاس تو سوا اس تصور کے کہ ''ساری اخلاقیات فضول ہے'' اور کچھ ہے ہی نہیں۔ مزید برآں یہ بھی کہ وہ تمام چیزیں جو بلند تر نظر آتی ہیں فی الحقیقت کم مایہ اور ذلیل ہیں۔

لارڈ کنیز کی مثال ہمارے سامنے ہے، فرماتے ہیں: ''کم از کم آئندہ سو برسوں تک ہمیں خود کو بھی اور دوسروں کو بھی یہ بتانا ہے کہ بدی نیکی ہے اور نیکی بدی ہے، اس لیے کہ بدی نفع بخش ہے جب کہ نیکی نہیں ہے۔ حرص، سود اور احتیاط (معاشی تحفظ) ابھی کچھ مدت تک ہمارے اوتار بنے رہنے چاہییں۔''

جب بڑے اور ذہین آدمی اس طرح کی باتیں کرنے لگیں تو نیک و بد کا گڈمڈ ہو جانا لازمی ہے اسی سے نسبتاً پرسکون حالات میں دوغلا پن اور افراتفری کے حالات میں جرائم پیدا ہوتے ہیں۔ کینز کے لیے تو حرص، سود اور احتیاط (معاشی تحفظ) ایک روشن خیال تھا، اُن کے پاس یقیناً اعلیٰ تصورات تھے لیکن اس سرزمین پر تصورات بڑی قوت کے حامل ہوتے ہیں۔ جن تصورات کی

پرستش کی انہوں نے سفارش کی آج وہ دیوتائی سنگھاسن پر جلوہ افروز ہیں۔

اخلاقیات اور دوسرے شعبوں میں ہم اپنی کلاسیکی عیسائی وراثت ضائع کر چکے ہیں حتیٰ کہ ان الفاظ کو بھی بھول چکے ہیں جن کے بغیر اخلاق کی کوئی گفتگو ممکن ہی نہیں ہے، مثلاً خوبی، محبت اور اعتدال۔ اب چونکہ ہمارے پاس وہ آلات ہی نہیں جن کے ذریعے ہم سوچ سکیں لہٰذا اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اخلاقیات کے بارے میں سوچنا ہی بیکار ہے۔

تعلیم کے مسائل اس عہد کے عمیق ترین مسائل کا عکس ہیں۔ انہیں محض ادارتی نظم وضبط، اخراجات اور انتظامی امور سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں لیکن ہماری بیماری مابعد الطبیعیاتی نوعیت کی ہے لہٰذا اس کا علاج بھی مابعد الطبیعیاتی ہونا چاہیے۔ ایسی تعلیم جو ہمارے مرکزی ایقان کی وضاحت نہیں کر سکتی تعلیم نہیں محض تربیت ہے یا پھر لت۔ گڑبڑ ہمارے مرکزی یقین وایمان میں ہے اور اگر ہمارا مابعد الطبیعیات دشمن میلان قائم رہتا ہے تو یہ گڑبڑ بڑھتی جائے گی۔ ایسی صورت میں بجائے اس کے کہ تعلیم ہمارے لیے عظیم وسیلہ ثابت ہو یہ تباہی کا ذریعہ بن جائے گی۔

MashalBooks.com

زمین کا صحیح استعمال

مادی وسائل میں سب سے زیادہ اہمیت زمین کی ہے۔ یہ دیکھ کر کوئی معاشرہ اپنی زمین کیسے استعمال کر رہا ہے، آپ اُس کے مستقبل کے بارے میں صحیح اندازہ نکالیں گے۔

ہر زمین کی ایک بالائی سطح ہوتی ہے اور بالائی سطح پر بے شمار مخلوق ہوتی ہے جس میں آدمی بھی شامل ہے۔ ۱۹۵۵ء میں ٹامکیل اور ورنان گل کارٹر نے ایک کتاب شائع کی، جس کا نام تھا ''بالائی سطح اور تمدن''۔ اس کتاب کے ابتدائی حصے سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''متمدن انسان نے کم و بیش اپنے ماحول پر عارضی قدرت حاصل کی۔ اس کی بنیادی مشکلات اس وقت شروع ہوئیں جب اس نے یہ سمجھا کہ اس کا اقتدار مستقل نوعیت کا ہے۔ اس نے خود کو ''دنیا کا مالک'' سمجھنا شروع کر دیا جب کہ وہ مکمل طور پر فطرت کے قوانین سمجھنے سے قاصر رہا۔

آدمی خواہ متمدن ہو یا وحشی بہر حال فطرت کا پروردہ ہے۔ وہ فطرت کا مالک نہیں ہے۔ اگر وہ ماحول پر اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتا ہے تو اُسے بعض فطری قوانین سے مطابقت رکھنی ہوگی۔ جب وہ قوانین فطرت کو توڑتا ہے تو وہ اسی فطری ماحول کو برباد کر دیتا ہے جو اس کی پرورش کرتا ہے۔ اور جب اس کا ماحول تیزی سے مائل بہ تباہی ہوتا ہے تو تمدن کی بربادی شروع ہو جاتی ہے۔

کسی نے تاریخ کا ایک مختصر خاکہ اس قول میں پیش کیا ہے: ''متمدن انسان سطح زمین پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا اور اپنے نقوشِ قدم سے ریگستان بناتا گیا۔''

یہ بیان مبالغہ آمیز ہے لیکن بنیادی حقیقت سے عاری نہیں۔ متمدن انسان نے اکثر زمینوں کو، جس پر ایک مدت اس کی رہائش رہی، برباد کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی تمدن کا ارتقا مختلف مقامات پر ہوتا رہا۔ قدیم آباد علاقوں میں انسانی تمدن کی بربادی کا بنیادی سبب یہی ہے اور یہی عنصر تاریخ کے تمام تر رجحانات کا تعین کرنے میں سب سے اہم رہا ہے۔

مورخین نے زمین کے استعمال کی اہمیت کو کم ہی تسلیم کیا ہے۔ انہوں نے اس بات

کو تسلیم نہیں کیا ہے کہ انسانی سلطنتوں اور تمدنوں کے مقدر کا تعین زیادہ تر زمین کے طریق استعمال نے کیا ہے۔ تاریخ پر ماحول کے اثرات کو تسلیم کرنے کے باوجود وہ اس بات کی طرف توجہ نہیں دیتے کہ انسانوں نے بالعموم ماحول کو تبدیل یا برباد کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسانوں نے سازگار ماحول کو کیسے تباہ کیا؟ بنیادی طور پر فطری وسائل کو تباہ و برباد کر کے۔ اس نے پہاڑوں اور وادیوں سے قابل استعمال درختوں کو کاٹ ڈالا یا جلا ڈالا۔ ان چراگاہوں کو جو اس کے مویشیوں کے لیے تھیں زیادہ سے زیادہ استعمال سے ننگا کر دیا۔ اس نے جنگلوں کے چرند پرند اور پانی کی مچھلیوں اور دیگر زیرآب مخلوق کا قتل عام کیا۔ اس نے بنجر پن کو روکنے کی کوشش نہیں کی اور اس کے کھیتوں کی زمین کی تخلیقی قوت ختم ہوگئی۔ اس کے چشمے، نہریں اور پانی کے ذخیرے مٹی سے اَٹ گئے۔ اس نے زیر زمین پائی جانے والی کیمیائی اشیا اور دھاتوں کو کثرت استعمال سے ضائع کیا۔ تب اس کا تمدن اس کی اپنی کارکردگی سے برباد ہوا یا اس نے کسی اور علاقے کی طرف ہجرت کی۔ دس سے لے کر تیس تمدنوں نے بربادی کا یہی راستہ اختیار کیا (تمدنوں کی تعداد مختلف درجہ بندیوں پر منحصر ہے)۔

ماحول کے مسائل اتنے نئے نہیں ہیں جتنا اکثر ظاہر کیا جاتا ہے۔ تاہم ان میں دو بین امتیازات قائم کیے جاسکتے ہیں۔ اول یہ کہ پہلے کے مقابلے میں زمین پر آبادی کثرت سے بڑھ گئی ہے۔ دوم یہ کہ اب ایسے علاقے باقی نہیں ہیں جہاں ہجرت کی جاسکے۔ مزید کہ اب تبدیلیاں ہوگئی ہیں بالخصوص پچھلے پچیس برسوں میں۔

اس کے باوجود آج یہ یقین راسخ ہوگیا ہے کہ پہلے زمانے میں خواہ کچھ ہوا ہو، ہمارا آج کا مغربی تمدن فطرت کی گرفت سے آزاد ہو چکا ہے۔ یوجین رابینووچ، اٹامک سائنسدانوں کے بلیٹین کے چیف ایڈیٹر ۱۹۲ اپریل ۱۹۷۲ء کے ''دی ٹائمز'' میں لکھتے ہیں: ''وہ جاندار، جن کا عدم وجود اس سرزمین پر حیات انسانی کے لیے خطرہ بن سکتا ہے، وہ جراثیم ہیں جو انسانی جسم میں پائے جاتے ہیں۔ بقیہ سے متعلق اس بات کا یقینی ثبوت نہیں ہے کہ ان کے بغیر انسان ایک جاندار کی حیثیت سے زندہ رہ سکتا ہے یا نہیں بشرطیکہ ایسے اقتصادی طریق کار ترقی پا جائیں جن کے ذریعے غیر نامیاتی خام مواد سے خوراک اخذ کی جاسکے اور جلد یا بہ دیر ہو کر رہے گا۔ یہاں تک

کہ آدمی اس نباتات سے بھی بے نیاز ہوسکتا ہے جس کا وہ آج اپنی خوراک کے لیے محتاج ہے۔۔۔۔''

میں ذاتی طور پر اور شاید میری طرح اور بہت سے انسان حیوانات و نباتات کے بغیر زندگی گزارنے کے قصور سے ہی کانپ اٹھتے ہیں لیکن شہری جنگلوں کے کروڑوں باسی، نیویارک، شگاگو، لندن یا ٹوکیو کے رہنے والے، اپنی پوری زندگی جانوروں کے بغیر گزار دیتے ہیں اور زندہ ہیں (چوہے، لال بیگ اور اسی قسم کے دوسرے مکروہ وجود اس سے مستثنیٰ ہیں)۔

یوجین رابینو وچ کو اس بات کا بہت گلہ ہے کہ بہت سے مشہورہ سائنسدانوں نے حالیہ برسوں میں بہت سی ایسی تحریریں لکھی ہیں جو عقلی دلائل پر پوری نہیں اترتیں۔ یہ تحریریں ''فطری ماحول کے نظام کی حرمت، ان میں مضمر استحکام اور ان میں انسانی مداخلت کے خطرات'' سے متعلق ہیں۔

''عقلیت'' اور ''حرمت'' کیا ہے؟ آدمی فطرت کا مالک ہے یا اس کا پروردہ؟ اگر غیر نامیاتی اجزاء سے ''مرکباتی خوراک'' تیار ہو سکے ''جو جلد یا بدیر ہو جائے گی'' اور اگر ہم نباتات سے آزاد ہو جائیں تو تمدن اور زمین کا رشتہ ختم ہو جائے گا؟ ان سوالات سے یہ پتا چلتا ہے کہ ''زمین کے صحیح استعمال'' کا مسئلہ نہ تکنیکی ہے اور نہ معاشی بلکہ مابعد الطبیعیاتی ہے۔ اس مسئلے کا تعلق بالاتر فکر سے ہے، اس فکر سے نہیں جس کی نمائندگی یوجین رابینو وچ کر رہے ہیں۔

ہمارے بعض اعمال کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ اور بعض مقصود بالذات ہوتے ہیں۔ کسی معاشرے کے لیے یہ بڑی اہمیت کی بات ہے کہ وہ مقصد اور ذریعے میں امتیاز قائم کرے اور اس سے متعلق کوئی متفقہ زاویۂ نظر پیدا کرے۔ اب یہ سوچیے کے زمین محض ذریعہ پیداوار ہے یا اس سے بڑھ کر کچھ اور یعنی مقصود بالذات البتہ جب میں زمین کہتا ہوں تو میری مراد زمین اور اس کی مخلوقات دونوں سے ہوتی ہے۔

جو چیز مقصود بالذات ہوگی اس پر مقداری اعداد و شمار کا اطلاق نہیں ہوگا۔ کیا ہم صفائی کا خیال محض حفظانِ صحت کی خاطر کرتے ہیں؟ جی نہیں۔ حفظانِ صحت کے تصور کی حیثیت تو محض ثانوی ہے۔ صفائی ایک قدر ہے۔ اس میں معاشی شماریات کا کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ صفائی معاشی طور پر فضول خرچی ہے۔ اس میں پیسہ اور وقت دونوں صرف ہوتے ہیں اور حاصل کچھ نہیں ہوتا بجز صفائی کے۔ بہت سے کام فضول خرچی پر مبنی ہوتے ہیں لیکن پھر

بھی ہم انہیں کرتے ہیں کہ وہ مقصود بالذات ہوتے ہیں۔ معاشیات دان تو یہ کرتے ہیں کہ ہر کام کو پیداوار اور صرف کی ذیل میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ پیداوار کے ذیل میں جو کچھ ہو اس پر شماریات کا اطلاق ہوگا۔ صرف کی ذیل میں جو کام ہو اس پر نہیں ہوگا۔ لیکن حقیقی زندگی میں پیدا کرنے والے اور صرف کرنے والے دونوں ہی انسان ہوتے ہیں جو ایک ہی وقت میں پیدا بھی کرتے ہیں اور صرف بھی۔ زندگی کی سہولتیں جو بالعموم صرف کی ذیل میں آتی ہیں آخر کچھ نہ کچھ تو پیدا کرتی ہی ہیں۔ صابن اور پانی کا مصرف بھی تو صفائی پیدا کرنے کے لیے ہی ہوتا ہے۔

تاہم معاشیات دان آدمی کو دو خانوں میں بانٹ دیتا ہے: پیداواری آدمی اور صارف ___ اگر پیداواری آدمی لمبی چوڑی گاڑی میں سفر کرتا ہے تو وہ اصراف کر رہا ہے اور اگر صارف ویسی ہی گاڑی میں سفر کرتا ہے تو وہ اعلیٰ معیارِ زندگی کا اظہار کرتا ہے۔

خیال کی یہ ثنویت سب سے زیادہ زمین کے استعمال میں نظر آتی ہے۔ کسان کو محض پیدا کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ ہر وہ ممکن طریقے سے اپنی صلاحیت کار کو بڑھائے، لاگت میں کمی کرے خواہ اس طریق کار سے زمین برباد ہو جائے، خوبصورت مناظر تباہ ہو جائیں اور لوگ گاؤں اُجاڑ کر شہروں کی طرف مراجعت کر جائیں۔ آج بہت سے بڑے پیمانے پر کاشت کرنے والے، باغات لگانے والے ایسے ہیں جو خود اپنی پیداوار کو مصرف میں نہیں لاتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''خوش قسمتی سے ہمارے پاس اتنی رقم ہے کہ ہم ان اشیاء خوردنی کو خرید سکیں جو ''زہر'' کے استعمال کے بغیر کاشت کی جاتی ہیں۔'' اب اگر ان سے کوئی پوچھے کہ تم خود ''زہر'' کا استعمال بند کیوں نہیں کرتے تو ان کا جواب ہوگا ''ہمیں اس سے مفر نہیں۔'' ''پیداوار'' ایک بات کی متقاضی ہے ''صرف'' دوسری بات کا۔ لیکن پیدا کرنے والا اور صارف دونوں ایک ہی شخص ہوتے ہیں اس لیے یہ سوال کہ انسان یا معاشرے کا تقاضا ہے، فکری انتشار کو جنم دیتا ہے۔

اس فکری انتشار سے اس وقت تک مفر نہیں جب تک ہم یہ سمجھنا نہ چھوڑیں کہ زمین اور اس کی مخلوق محض ذریعہ پیداوار نہیں۔ بطور ذریعہ ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ بنیادی طور پر وہ مقصود بالذات ہیں اور ایک خاص مفہوم میں حرمت کے حامل، اس لیے کہ انہیں ہم نے نہیں خدا نے پیدا کیا۔ انہیں برباد کر کے ہم دوبارہ پیدا نہیں کر سکتے اس لیے ہمیں ان کو استعمال کرنے کا وہ حق نہیں ہے جو خود اپنی پیدا کردہ چیزوں پر ہے۔

Mashalbooks.com

بڑے جانور اپنی افادیت کے باعث معاشی قدر کے حامل بھی ہوتے ہیں مگر ان میں ماورائے معیشت ایک اور قدر بھی ہوتی ہے۔ میں معاشی کفایت شعاری کے تقاضوں کے مطابق اپنی موٹر کر بلا دیکھ بھال دوڑا دوڑا کر خراب کر دوں تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا اس لیے کہ انسان کی بنائی ہوئی موٹر میں ''حرمت'' نہیں ہوتی ہے۔ مگر خدا کی مخلوق کو، زندہ حساس مخلوق کو محض افادیت کے تقاضوں کے مطابق استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

ایسے سوالات، جن کی نوعیت مابعد الطبیعیاتی ہوتی ہے، سائنسی جواب کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ موٹر گاڑی اور جانور کو افادیت کی بنیاد پر یکساں قرار دینا درجاتِ وجود سے منکر ہونا ہے۔ مذہبی معتقدات کے مطابق انسان کو اللہ تعالیٰ کی دیگر مخلوقات پر حاکمیت دی گئی مگر اس لیے نہیں کہ وہ ان پر ظلم کرے، انہیں تباہ کرے یا ختم کر دے۔ ایسے ولی اللہ یا بزرگانِ دین کبھی تاریخ میں پیدا نہیں ہوئے جو جانوروں پر ظلم کرتے ہوں یا انہیں محض افادی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوں۔ ایسی کہانیاں اور روایات لاتعداد ہیں جو ادنیٰ مخلوق سے محبت اور اس کی تحریم کا ذکر کرتی ہیں۔

سائنس کے نام پر جدید انسان کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ ایک تگا لنگور ہے یا ذرات کا اتفاقی مجموعہ۔ پروفیسر جوشوا لیڈ برگ انسان کی تعریف یوں کرتے ہیں: ''کاربن، ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور فاسفورس کے ذرات کا چھٹا مجموعہ'' جدید انسان خود کو اتنا حقیر پاتے ہوئے جانوروں کو حقیر تر گردانتا ہے اور ان کے ساتھ مشینوں والا سلوک کرتا ہے۔

جو کچھ اس سرزمین کے حیوانات کے لیے صحیح ہے زمین کے لیے بھی صحیح ہے۔ اس کے باوجود کہ انسانی کج فہمی اور حرص نے زمین کی زرخیزی کو اس درجہ برباد کیا ہے کہ انسانی تمدنوں کی بنیادیں ہل گئی ہیں لیکن روایتی تعلیم نے مہربان زمین کی مادرائے معیشت قدر اور اہمیت سے کبھی قطع نظر نہیں کیا۔ جب کبھی ایسی تعلیمات پر عمل کیا گیا تو صرف زراعت ہی نہیں بلکہ تمدن کے دوسرے عناصر نے بھی توانائی اور تکمیل حاصل کی۔ اس کے برعکس زمین سے بے اعتنائی برتنے اور فطرت کے اصولوں کی مخالفت نے زمین کی صحت کے ساتھ تمدن کے دوسرے عناصر کو بھی برباد کر دیا۔

ہمارے عہد میں قصبے والوں کی یہ کوشش زمین کے ساتھ ساتھ تمدن کے بیشتر عناصر کے لیے خطرہ ثابت ہو رہی ہے کہ زراعت کو صنعتی انداز دیا جائے۔ اس میں کسی شعبے کی گنجائش نہیں کہ زراعت اور صنعت کے بنیادی اصول ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ مگر زندگی کا آہنگ حفاظت

کی کشمکش سے پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح موت کے بغیر زندگی بے معنی ہے اسی طرح صنعت کے بغیر زراعت بے معنی ہوگی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ زراعت کی حیثیت بنیادی اور صنعت کی ثانوی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی صنعت کے بغیر تو باقی رہ سکتی ہے مگر زراعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ تمدن کا تقاضا یہ ہے کہ زراعت وصنعت کے متضاد پہلوؤں میں توازن قائم کیا جائے۔ اس توازن کی بربادی اس وقت ہوگی جب لوگ ان دونوں کے فرق کو، جو زندگی اور موت کے فرق کے مترادف ہے، بھول کر زراعت کو صنعت کی شکل دینے کی کوشش کریں گے۔

بین الاقوامی شہرت کے ماہرین کے خیالات ''یورپی زراعت کے مستقبل'' میں دیکھیے:

> دنیا کے مختلف علاقے مخصوص پیداوار سے مختلف فوائد حاصل کرتے ہیں جن کا تعلق آب وہوا، زمین کی ساخت اور اخراجاتِ محنت کے اختلافات سے ہے۔ سارے ممالک تقسیم کار سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں کہ اس سے وہ اپنی زرخیز زمین پر زراعتی کاوشوں کو زیادہ توجہ سے بروئے کار لا سکتے ہیں۔ اس سے زراعت کی آمدنی بڑھ جائے گی اور پوری معیشت بالخصوص صنعت کے اخراجات میں کمی آجائے گی لہٰذا زراعت کو ''تحفظ'' دینے کا کوئی خاص جواز نہیں۔

سوال یہ ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک اس آسان نسخے پر عمل کر کے فایدے کیوں نہیں اُٹھاتے؟ جواب یہ ہے کہ ''زراعتی کاوشوں'' میں محض آمدنی کی افزائش اور اخراجات میں کمی کے علاوہ اور بہت کچھ مضمر ہوتا ہے۔ اس میں انسان اور فطرت کے مابین تعلق، معاشرے کا پورا طریق حیات، انسانی زندگی کی صحت، مسرتیں اور آہنگ اور اس کے ماحول کا حسن سبھی کچھ شامل ہے۔ اگر ماہرین کے ذہن سے یہ تمام باتیں خارج ہو جائیں تو یوں سمجھئے خود ''انسان'' خارج ہو چکا ہے۔

بڑے تناظر میں دیکھیے تو زمین انسان کے لیے بے بہا عطیہ ہے۔ اس کا کام اس کی نگرانی اور دیکھ بھال ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زمین کی دیکھ بھال میں آدمی کے پیش نظر تین چیزیں ہونی چاہییں: صحت، حسن اور استحکام۔ ایک اور چوتھی چیز، جسے ماہرین بھی تسلیم کرتے ہیں، اس کی پیداوار ہے، تو یہ اول الذکر تین چیزوں کا ماحصل ہے۔ سطحی مادی نقطہ نظر زراعت کو غذائی پیداوار کا محض ایک ذریعہ قرار دیتا ہے۔ وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو زراعت کو مندرجہ ذیل تین کام سرانجام دینے چاہییں۔

۱۔انسان کو زندہ فطرت سے متعلق رکھنا جس کا وہ انتہائی ناتواں حصہ ہے۔

۲۔انسان کے رہائشی ماحول کو زیادہ سے زیادہ قابل قدر بنانا اور انہیں اعلیٰ انسانی صفات سے معمور کرنا۔

۳۔ان غذاؤں اور اشیا کی افزائش جو بہتر زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ایسا تمدن، جو پہلے دو اعمال کو مسترد کرتے ہوئے محض تیسرے پر شدت اور سختی سے عمل کرتا ہو، طویل مدت تک قائم رہ سکتا ہے۔

آج ہم اس بات پر بھی فخر کرتے ہیں کہ کھیت مزدوروں کی تعداد ہر جگہ کم ہے اور مزید کم ہوتی جارہی ہے۔ برطانیہ اپنی غذائی ضروریات کا ساٹھ فیصد خود پیدا کرتا ہے جبکہ اس کی آبادی کا محض تین فیصد ہی کھیتوں میں کام کرتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر امریکہ کے کھیت مزدور اس کے مجموعی کارکنوں کا ۲۷ فیصد تھے۔ جنگ عظیم دوم کے خاتمے پر تعداد چودہ فیصد رہ گئی اور ۱۹۷۱ء کے اندازے کے مطابق ان کی تعداد محض چار اعشاریہ چار فیصد ہے۔ کھیت مزدوروں کی اس مستقل کمی کو شہروں کی جانب عام مراجعت پر محمول کیا جاتا ہے۔ اب شہری صورت حال کے بارے میں لیوس ہربر کا بیان بھی دیکھتے چلیے:

> شہری زندگی نفسیاتی، معاشی اور حیاتیاتی شکست و ریخت کا شکار ہے۔ لاکھوں انسانوں نے اس شکست و ریخت کا ثبوت اپنے پیروں کی جنبش سے دیا ہے۔ انہوں نے اپنا ساز و سامان اُٹھایا اور چل کھڑے ہوئے۔ اگر وہ شہر سے اپنا تعلق توڑ نہیں سکے تو بھی کم از کم اس کی کوشش ضرور کی۔ معاشرتی علامت کے طور پر یہ بات اہمیت کی حامل ہے۔

ہربر کا خیال ہے کہ جدید شہروں کے باسی اپنے دیہی اجداد کے مقابلے میں زیادہ تنہائی کا شکار ہیں۔ ''جدید شہری بے نامی، معاشرتی ٹوٹ پھوٹ اور روحانی احساس تنہائی کا اس حد تک شکار ہو چکا ہے کہ انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔''

اب صورت حال یہ ہے کہ شہری شہر کو چھوڑ کر مضافات کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ دیہاتی شہروں کی طرف جارہے ہیں۔ ڈاکٹر مان شولٹ یہ بتارہے ہیں کہ اب ''کوئی شخص غیر معاشی عمل کی عیاشی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔'' نتیجہ یہ ہے کہ ہر جگہ زندگی ناقابل برداشت ہوگئی ہے البتہ دولت مند حضرات اس سے مستثنیٰ ہیں۔

MashalBooks.com

میں جناب ہربرکے اس دعوے کی تائید کرتا ہوں کہ اب ''انسان کی فطرت سے ہم آہنگی میں محض اس کی بہتری نہیں، یہ اس کی ضرورت ہے۔'' یہ ضرورت محض سیر وسیاحت اور تفریحی سفر سے پوری نہیں ہوسکتی۔ اس لیے زراعت کے پورے نظام کو تبدیل کرنا پڑے گا، دیہی تہذیب کو از سرنو منظّم کرنا ہوگا اور زمین سے سہ گونہ نصب العین ___ صحت، حسن اور استحکام ___ کی بنیاد پر تعلق قائم کرنا ہوگا۔

بڑے پیمانے پر میکانکی زراعت اور کیمیائی ادویات کا استعمال زندہ فطرت کے انسانی تعلق میں کھنڈت ڈالتا ہے۔ محض یہی نہیں یہ آج کے انتہائی خطرناک میلانات مثلاً تشدد، لاتعلقی، اور ماحول کی بربادی میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ صحت حسن اور استحکام کو تو اس قابل بھی نہیں سمجھا جاتا کہ اس پر بحث ہو۔ یہ بھی انسانی اقدار سے بے توجہی کی ایک مثال ہے۔ یہی انسان کی وہ تذلیل ہے جو ''معیشت پرستی'' سے پیدا ہوتی ہے۔

آج ہمیں ''مادرائے معیشت'' اقدار پر یقین محکم نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی جگہ معاشی اعداد وشمار نے لے لی ہے۔ فطرت خلاء کی دشمن ہے اور جب موجودہ روحانی مکانیت میں زندگی کے اعلیٰ محرکات کے لیے گنجائش نہیں رہتی تو اس کی جگہ ادنیٰ چیزیں لے لیتی ہیں یعنی زندگی کا سطحی، گھٹیا شماریاتی رجحان ___ جسے معاشی شماریات کا نام دے دیا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زمین اور اس کے باسی حیوانات کے ساتھ سفاکانہ رویہ بہت سے اور میلانات کی علامت ہے۔ مثلاً بے سروپا تبدیلیوں کی خواہش اور اعجوبگی سے بے پناہ دلچسپی ___ جن کی نوعیت تکنیکی، تنظیمی، کیمیائی، حیاتیاتی وغیرہ ہوسکتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ ان کے دوررس نتائج کو سمجھا جائے انہیں جلد از جلد منطبق کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ زمین کو، جو انسانوں کے علاوہ ہمارے وسائل میں سب سے زیادہ اہم ہے، کس طرح استعمال کیا جائے؟ اس سادے سے سوال میں ہمارا پورا طرز حیات مضمر ہے۔ اس سے پہلے کہ زمین کے بارے میں ہم اپنے رویوں کو بدلیں ہمیں اپنے فلسفہ حیات اور مذہبی رجحانات میں تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ اگر ہم ''مادرائے معیشت'' اقدار کو تسلیم کرلیں تو ہماری زمین از سرنو صحت منداور خوبصورت ہوجائے گی اور لوگ احترام آدمیت دوبارہ پالیں گے۔

Mashalbooks.com

صنعتی وسائل

جدید صنعتوں کے بارے میں ایک عجیب بات یہ نظر آتی ہے کہ ان کی احتیاجات زیادہ ہیں اور کام نسبتاً نہایت کم۔ ان کی نااہلیت انسانی تخلیق میں بھی نہیں آسکتی لہٰذا لوگ اس پر غور نہیں کرتے۔

امریکہ جدید صنعتی ممالک میں سب سے آگے ہے۔ رقبے کے تناسب کے حوالے سے دیکھیے تو امریکہ کی آبادی انگلستان کی آبادی کے مقابلے میں دس گنا اور بعض یورپی ممالک کی گنجان آبادی کے مقابلے میں تقریباً اکتالیس گنا کم ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ امریکہ کی آبادی زیادہ اور رقبہ کم ہے۔ اگر دنیا کی آدھی آبادی امریکہ میں بس جائے تب کہیں جا کر وہ اتنا گنجان ہوگا جتنا گنجان آباد انگلستان ہے۔

یہ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ امریکہ میں فطری وسائل کی کمی ہے۔ اس کے برعکس پوری انسانی تاریخ میں اتنا وسیع خطہ ارض اتنے کثیر وسائل کا حامل نہیں ملتا۔ گو وہاں اب تک بہت کچھ استعمال اور برباد ہو چکا ہے اس کے باوجود یہ بیان اب بھی درست ہے۔

اس کے باوجود امریکہ کا صنعتی نظام اپنے داخلی وسائل پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ خام مواد کے لیے اسے پوری دنیا پر گرفت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ دنیا بھر کی آبادی کے پانچ اعشاریہ چھ فیصد امریکیوں کے لیے دنیا کے چالیس فیصد بنیادی خام وسائل کی کھپت ہوتی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں امریکہ کی تیل کی ضروریات کا ستاون فیصد یعنی اسی کروڑ ٹن باہر سے منگوایا گیا۔ یہ مقدار اس کے برابر ہے جتنا کہ جاپان اور مغربی یورپ کے تمام ممالک نے مشرق وسطیٰ اور افریقہ سے برآمد کیا۔

وہ صنعتی نظام، جو دنیا کی چھ فیصد سے بھی کم آبادی کے لیے دنیا کے چالیس فیصد بنیادی وسائل کا استعمال کرتا ہے، محض اسی صورت میں قابل تعریف ہوسکتا ہے جب وہ انسانی مسرتوں، خوشحالی، تہذیب، امن اور سکون کو پیدا کر سکے۔ اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ امریکی صنعتی نظام نے یہ توقعات پوری نہیں کیں اور اس توقع کی بھی کوئی گنجائش نہیں کہ دنیا کے محدود وسائل کے زیادہ استعمال اور زیادہ بڑی صنعتی ترقی سے یہ مقاصد حاصل ہوسکیں گے۔ اگر آج

MashalBooks.com

پروفیسر والٹر ہلر کے اس بیان کو تسلیم کر لیا جائے کہ ''میں زیادہ صنعتی ترقی کے بغیر کامیاب معیشت کا تصور بھی نہیں کر سکتا'' اور امریکی معیشت دنیا سے اس کے وسائل کا زیادہ سے زیادہ حصہ خود صرف کرے تو اندازہ لگائیے کہ دنیا کی آبادی کے چورانوے اعشاریہ چار فیصد کا کیا ہوگا جو صنعتی لحاظ سے امریکہ سے بہت پیچھے ہے۔

مان لیجیے کہ بڑی صنعتی ترقی کے بغیر ماحول کی آلودگی کے خلاف جنگ نہیں کی جا سکتی جیسا کہ والٹر ہلر کا خیال ہے، مگر ماحول کی آلودگی تو خود صنعتی ترقی کا نتیجہ ہے۔ اس شیطانی چکر سے کیسے نکلا جا سکتا ہے۔ پھر سوال یہ ہے:

زمین کے وسائل ایسی صنعتی ترقی کے فروغ کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ جس کا صرف اتنا زیادہ ہو اور حاصل اتنا کم۔

دنیا کے معدنی وسائل کے امریکی صرف کے بارے میں ایم۔آئی۔ٹی کے ماہرین کے ایک گروپ نے ایک رپورٹ تیار کی ہے۔ یہ بتاتے ہوئے کہ صنعتی فروغ کی رفتار کے پیش نظر ایک معینہ مدت میں یہ وسائل ختم بھی ہو سکتے ہیں، ماہرین محتاط پیش گوئی کرتے ہیں:

> موجود وسائل کے صرف کی رفتار کے پیش نظر اور اس رفتار میں مزید اضافے کو سامنے رکھتے ہوئے آج کے ایسے اہم وسائل، جن کی تجدید نہیں ہو سکتی، سو برس بعد انتہائی مہنگے ہو جائیں گے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی اہم ہے کہ وسائل کی یافت میں سیاسی تعلقات کی نوعیت بھی مضمر ہے:

> جنوبی امریکہ کی کانوں کا قومی ملکیت میں لیا جانا اور مشرقِ وسطیٰ کا تیل کی قیمتوں میں اضافے کے لیے دباؤ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ معاشی نوعیت کے سوالات کے اُبھرنے سے بہت پہلے سیاسی سوالات پیدا ہوں گے۔

ایم۔آئی۔ٹی گروپ بالآخر اپنے مفروضوں کی مدد سے اسی حقیقت کی طرف پہنچتا ہے کہ محدود دنیا سے لامحدود وسائل کی توقع لایعنی بات ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے لمبے چوڑے تفصیلی مطالعے کی ضرورت نہ تھی، محض بصیرت ہی کافی تھی۔ جدید صنعتی نظام کو وسائل کی کمیابی یا قیمتوں کی زیادتی سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے جیسا کہ ایم۔آئی۔ٹی۔ گروپ نے بڑی مشقت سے واضح کیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ زمین کے نیچے یہ وسائل کتنے ہیں؟ سمندر کے اندر کیا کیا

ہے؟ اور کتنا کچھ دوبارہ قابل استعمال بنایا جاسکتا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اور صنعتی جدتیں، جنہیں جدید سائنس کی اعانت حاصل ہے، اس محاذ پر شکست نہ کھا سکتیں؟

بہتر یہ ہوتا کہ ایم۔ آئی۔ ٹی گروپ محض ایک مادی عنصر پر اپنی تجزیاتی قوت صرف کرتا جس کی تجدید ناممکن نہیں ہے اور وہ ہے توانائی۔ اس سلسلے میں پچھلے ابواب میں ہم بحث کر چکے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ میکانکی دنیا کے لیے توانائی (انرجی) اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ انسانی دنیا کے لیے شعور۔ اگر توانائی ختم ہوجائے تو ہر چیز ختم ہوجائے گی۔ بنیادی توانائی کی کمی کا مطلب یہ ہوگا کہ دوسری بنیادی پیداوار کی طلب ہی بہت کم ہوجائے گی۔ اتنی کم کہ مزید کمی کا سوال ہی پیدا نہ ہوسکے گا۔

جدید معاشیات کا مقداری نقطہ نظر توانائی کے مسئلے کو بھی دیگر ہزاروں مسائل کی طرح کا محض ایک مسئلہ سمجھتا ہے جیسا کہ ایم۔ آئی۔ ٹی ٹیم کی کارکردگی سے ظاہر ہے۔ قدری تصورات سے تو ان کا بھی تعلق نہیں ہے یہاں تک کہ بڑائی اور اہمیت کے درجات بھی ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ''کوئلہ تو اب ختم ہو رہا ہے، اب اس کی جگہ پٹرول لے گا'' اور جب انہیں یہ بتایا جائے کہ اس طرح تو تیل بھی ختم ہوجائے گا تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ کوئی بات نہیں ''ہم جلد ہی نیوکلیر عہد میں داخل ہونے والے ہیں'' لہٰذا کسی بات کے بارے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بے شمار ذرائع سے اعداد و شمار کے ذریعے یہ ثابت کیا جارہا ہے کہ یورپی کوئلے کی مانگ کم ہوتی جارہی ہے اور بہت جلد اتنی کم ہوجائے گی کہ ہمارے سامنے یہ مسئلہ کھڑا ہوجائے گا کہ کان کنوں سے کیسے چھٹکارا پایا جائے۔ اس قسم کی باتیں کرنے والے مسائل کو وحدت میں نہیں دیکھتے اور اس قسم کے خیالات محض ذہنی انتشار کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

اس سوچ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی یورپ کی کوئلے کی صنعت پہلے کی نسبت آدھی کردی گئی۔ محض یورپ برادری ہی کی نہیں انگلستان میں بھی یہی حال ہوا۔ مگر ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان یورپی برادری کی ایندھن کی درآمد تیس فیصد سے بڑھ کر کم و بیش ساٹھ فیصد ہوگئی اور انگلستان کی درآمد پچیس فیصد سے چوالیس فیصد ہوگئی۔ اگر پوری صورت حال پر غور کیا جاتا تو آئندہ آنے والی صورت حال کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ معیشت دانوں کے بہکاوے میں آکر مغربی یورپ نے اپنی کوئلے کی صنعت جان بوجھ کر تباہ کی۔ گویا کوئلہ بازار میں بکنے والی جنس سے

زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کہ جب تک نفع مل رہا ہے ٹھیک ہے وگرنہ اس کی کوئی وقعت نہیں۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے کسی گہری بصیرت کی ضرورت نہیں کہ ایٹمی توانائی کا مستقبل بعید میں جو کردار بھی ہو دنیا کی صنعتوں کو اس صدی کے باقی ماندہ عرصے میں تیل کی مدد سے ہی چلنا ہے۔ آج سے دس یا بیس سال بعد تیل کا کیا حال ہوگا؟ اس کے متعلق بھی دیکھتے چلیے۔ اپریل ۱۹۶۱ء کے ایک لیکچر کے مطابق:

''.....مستقبل کی تیل کی پیداوار اور اسی کی طرح ایٹمی توانائی کی پیداوار کے بارے میں بہت سے لوگ لامحدود رجائیت کے حامل نظر آتے ہیں جو مطلقاً خلاف عقل بات ہے..... یہ سمجھا جاتا ہے کہ فی زمانہ تیل کی کھپت کے اعتبار سے موجود وسائل چالیس سال کے لیے اور متوقع وسائل آئندہ دو سو سال کے لیے کافی ہوں گے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ تیل کی کھپت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی۔ اس کی مستقل بڑھوتی کی ایک تاریخ ہے جس کے مطابق سال بہ سال یہ کھپت چھ یا سات فیصد بڑھتی رہتی ہے.....ساری دنیا میں صنعت تیزی سے پھیل رہی ہے جس کے باعث تیل کی کھپت زیادہ سے زیادہ ہوتی جائے گی.....لہٰذا ہمارے لیے یہ لمحۂ فکر یہ ہے کہ اس طرح یہ سلسلہ کب تک جاری رہ سکے گا؟''

اس قسم کی تنبیہات سن ساٹھ کی دہائی میں متواتر کی جاتی رہیں لیکن انہیں درخور اعتنا نہ سمجھا گیا، یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء کا بحران پیدا ہو گیا۔ تیل کی ہر نئی دریافت کو خواہ وہ افریقہ میں ہو، نیدر لینڈ میں ہو، بحر شمالی یا الاسکا میں ہو، ایک عظیم واقعہ سمجھا جاتا ہے اور یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ یہ دریافت مستقبل کی متوقع صورت حال کو تبدیل کر دے گی۔ تاہم واقعات اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں کہ جو پیش گوئی اب سے بیس برس پہلے کی جا چکی تھی آج کے حالات پیش نظر وہ بھی انتہائی چھوٹے پیمانے کی تھی۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں تیل کی کمپنیاں بہت زیادہ یقین دہانیاں کرایا کرتی تھیں۔ ان کے پیش کردہ اعداد و شمار اصل حالات کے پیش نظر غلط ثابت ہوئے۔ اب کہ یورپ کی کوئلے کی صنعت آدھی تباہ ہو چکی ہے، تیل کی کمپنیوں کے لہجے میں بھی فرق آ گیا ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ اوپیک (پٹرول برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم) کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا کہ عرب ممالک آپس میں بھی متفق الرائے نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ دوسرے غیر ممالک کے ساتھ۔ آج یہ ثابت

ہوگیا ہے کہ اوپیک کی اجارے داری انتہائی ثابت قدم ہے۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ تیل برآمد کرنے والے ممالک درآمد کرنے والوں کے اتنے ہی محتاج ہیں جتنے کہ یہ ممالک اُن کے آج یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ یہ سوچ بھی محض ہماری خواہشات کے تابع تھی۔ اس لیے کہ درآمد کرنے والوں کی طلب اتنی زیادہ ہے کہ تیل پیدا کرنے والے ممالک متحد ہو کر محض اپنے تیل کی برآمدات کو کم کر کے اپنے محصولات میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اگر تیل کی قیمتیں بہت زیادہ بڑھ جائیں تو بازار میں اس کی طلب ہی ختم ہو جائے گی لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ تیل کا کوئی ایسا بدل موجود نہیں جو اتنے بڑے پیمانے پر تیل کی غیر موجودگی میں ضروریات پوری کر سکے لہٰذا اس کی طلب کا بازار سے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تیل پیدا کرنے والے ممالک اب یہ بات سمجھ گئے ہیں کہ محض دولت سے وہ اپنی آبادی کے لیے روزی کے نئے وسائل پیدا نہیں کر سکتے۔ تیل ختم ہو جانے والی چیز ہے اور جتنی تیزی سے یہ ختم ہوگا کسی نئے معاشی وسیلہ حیات کو قائم کرنے کے لیے اتنا ہی کم وقت ہوگا لہٰذا یہ بات تیل پیدا کرنے والے اور تیل درآمد کرنے والے ممالک کے حق میں ہے کہ تیل کی ''زندگی کی توسیع'' کی جائے۔ برآمد کرنے والے ممالک کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ نئے ''وسائل حیات'' کی دریافت کریں اور درآمد کنندگان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی احتیاج پوری کرنے کے لیے تیل کے علاوہ توانائی کے کسی اور وسیلے کی دریافت کریں کیونکہ تیل کو جلد یا بہ دیر ختم ہو جانا ہے اور آج زندہ لوگوں کی زندگی ہی میں ایسا موقع آ سکتا ہے۔

جہاں تک تیل درآمد کرنے والے ممالک کا تعلق ہے ان میں مغربی یورپ اور جاپان کو شدید مسائل کا سامنا ہے۔ ابھی کچھ ہی مدت پہلے تک مغربی یورپ کو یہ خوش فہمی لاحق تھی کہ ''اب ہم لامحدود اور سستی توانائی کے عہد میں داخل ہو رہے ہیں''۔ دیگر لوگوں کے علاوہ مشہور سائنسدانوں کا بھی یہ خیال تھا کہ مستقبل میں توانائی دوا کی طرح بازار میں مل سکے گی۔'' ایندھن کی پالیسی کے متعلق برطانوی قرطاس ابیض کی نومبر ۷۶ء کی اشاعت میں یہ اعلان شامل تھا:

> بحرشمالی میں قدرتی گیس کی دریافت برطانوی توانائی کے پیداواری ارتقاء میں ایک اہم واقعہ ہے۔ یہ دریافت اس وقت ہوئی ہے جب ایٹمی توانائی کی آمد آمد ہے جو توانائی کے ضمن میں بہت بڑا وسیلہ ہوگی۔ یہ دونوں مل کر توانائی کی پیداوار اور کھپت

کے موجودہ سانچے میں جلد ہی بنیادی تبدیلیوں کی موجب ہوں گی۔

پانچ ہی سال گزرے تو معلوم ہوا کہ برطانیہ درآمدی تیل کا پہلے سے زیادہ محتاج ہو گیا ہے۔ اور یہ اس وقت ہوا جب کہ ایٹمی توانائی کی آمد آمد ہے۔ ماحولیات کے سیکریٹری آف سٹیٹ کو ۱۹۷۲ء میں جو رپورٹ پیش کی گئی اس میں توانائی کا ذکر اس طرح کیا گیا:

> مستقل کے توانائی کے وسیلوں کے متعلق جو شہادتیں اپنے ملک اور ساری دنیا کی بابت ہم تک پہنچیں وہ انتہائی تشویش ناک ہیں۔ تیل کے ایندھن کے خاتمے سے متعلق وقت کے اندازے مختلف ہیں لیکن زیادہ تر یہ بات تسلیم کی جا رہی ہے کہ ان کا وجود محدود ہے اور متبادل ایندھن کی دریافت اشد ضروری ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی بڑھتی ہوئی ضروریات، آبادی میں اضافے، نتائج سے بے خبر رہ کر توانائی کے بعض وسائل کا اندھا دھند استعمال، یہ کہ مستقبل کی توانائی کے حصول کے لیے معاشی طور پر زیادہ صرف ہوگا اور وہ خطرات جو ایٹمی توانائی اپنے جلو میں لائے گی، یہ تمام کے تمام ایسے عناصر ہیں جو بڑھتی ہوئی تشویش کا اسباب ہیں۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ ''بڑھتی ہوئی تشویش'' ۱۹۷۰ء میں پیدا نہیں ہوئی جس دوران میں کوئلے کی آدھی صنعت کو معیشت کے منافی قرار دے کر برباد کر دیا گیا اور ایک بار ختم ہو کر یہ ہمیشہ کے لیے نابود ہو گئی۔

MashalBooks.com

ایٹمی توانائی ـــــــ نجات یا لعنت؟

مستقبل میں توانائی کی پیداوار سے متعلق خود اطمینانی، جواب آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے بلا شبہ ایٹمی توانائی کے بروئے کار آنے کے باعث تھی جس کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ یہ بالکل صحیح وقت پر سامنے آ رہی ہے۔ یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی کہ آخر یہ ہے کیا بلا؟ یہ نئی تھی، چونکانے والی تھی، ترقی کی ضامن تھی اور عام توقع یہ تھی کہ یہ بہت سستی ہوگی۔ اب چونکہ نئے وسیلہ توانائی کی حاجت جلد یا بہ دیر یقینی تھی لہٰذا فوری طور پر یہی کیوں نہیں۔

کچھ مدت پہلے یہ بیان دیا گیا جو اس زمانے میں آزاد خیالی کا مظہر تھا: مذہب معیشت تیز رفتار تبدیلی کی پرستش پر زور دیتا ہے۔ اسے اس عام صداقت سے کوئی سروکار نہیں کہ ایسی تبدیلی جو غیر متنازع اصلاح احوال کی حامل نہ ہو اُس سے خیر کی توقع مشکوک ہے۔ ثبوت کا بوجھ ان لوگوں کے کندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے جو ماحولیاتی نقطہ نظر رکھتے ہیں یعنی جب تک کہ یہ لوگ اس بات کا واضح ثبوت پیش نہ کریں کہ کوئی چیز یقینی طور پر انسان کے لیے مضرت رساں ہے تبدیلی جاری رہے گی حالانکہ عام فہم کا تقاضا یہ ہے کہ ثبوت فراہم کرنے کی ذمے داری ان لوگوں کی ہونی چاہیے جو تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ گویا انہیں عملی طور پر یہ بتانا چاہیے کہ نتیجہ خرابی کی صورت میں ظاہر نہیں ہوگا۔ لیکن اس صورت میں وقت زیادہ صرف ہوگا اور یہ بات معیشت کے منافی ہے۔ دراصل ''ماحولیات'' کا موضوع سارے معیشت دانوں کے لیے لازمی طور پر جزو تدریس ہونا چاہیے..... ''ماحولیات'' یہ بتاتی ہے کہ ''لاکھوں برس کی مدت میں تیار شدہ ماحول کا تناظر بذاتہٖ ایک مخصوص اہمیت اور خوبی کا حامل ہے۔ ایک سیارے جیسی، پیچیدہ شے، جس میں پندرہ لاکھ انواع و اقسام کے نباتاتی و حیواناتی وجود ایک ساتھ اور کم و بیش متوازن و متناسب صورت میں رہتے بستے چلے آتے ہوں اور جو مسلسل زمین اور ہوا کے ایک ہی قسم کے مالیکیول

کا استعمال کرتے ہوں، ان میں بے مقصد اور انجانے طریقوں سے ''ٹھونک

ٹھانک'' کے ذریعے بہتری کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔ کسی پیچیدہ ساخت میں ہر قسم کی تبدیلیاں بعض خطرات کی حامل ہوتی ہیں جنہیں تمام حقائق کے محتاط مطالعے کے بعد ہی برتنا چاہیے۔ پہلے پہل تو ان تبدیلیوں کو بہت چھوٹے پیمانے پر برتنا چاہیے تاکہ بڑے پیمانے پر ان کے انطباق سے پہلے ان کے اثرات کا جائزہ لے لیا جائے۔ اگر معلومات نامکمل ہوں تو تبدیلیوں کو فطرت کے عمل سے بہت قریب ہونا چاہیے کیونکہ اُس کے پاس یہ غیر متنازع شہادت موجود ہے کہ اس نے ایک مدت مدید تک زندگی کے استحکام کو قائم رکھا ہے۔

اس بات میں مزید جو دلائل پیش کیے گئے وہ اس نوعیت کے تھے:

فطرت کی کارگاہ میں جو تبدیلیاں انسان نے کی ہیں اُن میں سب سے خطرناک اہمیت ''نیوکلیر فشن'' کی ہے۔ ماحول کی آلودگی کا سب سے بڑا ذریعہ ریڈیائی اثرات کا ہے۔ اور یہی اس کی سرزمین پر آدمی کے وجود کے لیے سب سے زیادہ مہلک خطرہ ہے۔ عام آدمی کی توجہ تو ایٹم بم کی طرف ہے جس کے بارے میں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ شاید اس کا استعمال آئندہ کبھی نہ ہو لیکن نام نہاد پرامن مقاصد کے لیے ایٹمی توانائی کا استعمال انسانی زندگی کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہوسکتا ہے۔ معاشیات کی آمریت کی موجودگی کی اس سے زیادہ واضح مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔ اس بات کا فیصلہ معاشی سطح پر کیا جارہا ہے کہ اب توانائی کے مرکز روایت کے مطابق کوئلے اور تیل کی بنیاد پر قائم کیے جائیں یا ایٹمی توانائی کی بنیاد پر۔ اس فیصلے میں شائد تھوڑا بہت ان ''معاشرتی نتائج'' کا بھی خیال رکھا جاتا ہو جو کوئلے کی صنعت میں ضرورت سے زیادہ سرعت کے ساتھ کی جانے والی کمی سے پیدا ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ ''نیوکلیر فشن'' ناقابل فہم، ناقابل تقابل اور انسانی زندگی کے لیے عجیب وغریب خطرات پیدا کرسکتا ہے، نہ کبھی اعداد وشمار میں آتی ہے اور نہ اس کا کوئی تذکرہ ہوتا ہے۔ وہ لوگ، جن کا پیشہ ہی یہ ہے کہ خطرات کا جائزہ لیں مثلاً بیمہ کمپنیاں، وہ بھی ایٹمی توانائی کے مراکز کا بیمہ کرنے کے لیے دنیا میں کسی جگہ تیار نہیں ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے خاص قوانین بنائے جارہے ہیں جن کے مطابق ریاست خود ایسی بڑیلس ذمہ داریاں قبول کرے گی۔ بہرحال بیمہ ہو یا نہ ہو خطرہ اپنی جگہ موجود ہے اور مذہب معیشت کا جادو اس طرح سر چڑھا ہے کہ حکومت ہو یا عوام ان کے سامنے سوال محض یہ ہے کہ کیا ''یہ نفع بخش ہے؟''

آج انسانی جسم پر الفا، بیٹا اور گاما ریز کے مضر اثرات کے بارے میں تو سبھی جانتے ہیں۔ ریڈیائی ذرات نامیاتی جسم میں گولیوں کی طرح چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ ان کی پیدا کردہ خرابیوں کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان کی مقدار کتنی ہے اور یہ کن اقسام کے خلیوں کو زد میں لاتے ہیں۔ ریڈیائی اثرات کس پیمانے پر مہلک ثابت ہو سکتے ہیں یہ اب تک تجربے میں نہیں آئے البتہ یہ کہ محض ان کے لیے مضر نہیں ہوں گے جو ان سے متاثر ہوں گے بلکہ ان کی آئندہ نسلوں پر بھی اثر انداز ہوں گے۔

یہاں یہ انکشاف بھی اہم ہے کہ آدمی ایک بار ریڈیائی عمل جاری کر کے اس کے اثرات کو کم کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ کوئی کیمیائی ردعمل، کوئی طبیعیاتی مداخلت کسی کام نہیں آسکتی۔ البتہ محض وقت گزرنے کے ساتھ ریڈیائی اثرات کی شدت میں کمی آسکتی ہے۔ کاربن ۔۱۴ اپنی ریڈیائی قوت کا آدھا کرنے کے لیے چھ ہزار سال کی مدت لے گا۔ سٹرونٹیم _۹۰ کی آدھی زندگی اٹھائیس برسوں پر محیط ہوگی۔ آدھی زندگی خواہ کتنی ہی مدت کی ہو، یہ طے ہے کہ کچھ نہ کچھ ریڈائی اثرات ہمیشہ قائم رہیں گے اور ہم اس کے سوا کہ ریڈیائی قوت والے اجزا کو کسی محفوظ مقام پر رکھیں اور کچھ نہیں کر سکتے۔

لیکن اب یہ سوال ہے کہ ایٹمی ری ایکٹر سے پیدا ہونے والے ریڈیائی اثرات پر مشتمل ناکارہ جزا کی بہت بڑی مقدار کے لیے محفوظ مقام کیا ہے؟ اس سرزمین پر تو کوئی جگہ محفوظ قرار نہیں دی جاسکتی۔ ایک زمانے میں یہ خیال یہ تھا کہ انہیں سمندر میں ایسے گہرے مقامات پر پھینکا جاسکتا ہے جن کے متعلق یہ گمان تھا کہ وہاں زندگی کا کوئی وجود نہ ہوگا لیکن اسے بھی روسیوں نے جھٹلا دیا ہے۔ اب جیسے ہی آپ انہیں پانی میں ڈالیں گے تو ان کی بہت بڑی تعداد جاندار مخلوق کے جسم میں پہنچ جائے گی اور چونکہ ایک مخلوق دوسری مخلوق کی غذا ہے یہ ریڈیائی اثرات آدمی تک اپنی رسائی حاصل کر لیں گے۔

ناکارہ اجزا کو ٹھکانے لگانے کے متعلق ابھی تک کوئی بین الاقوامی سمجھوتہ نہیں ہوا۔ بین الاقوامی ایٹمی توانائی کی انجمن کا جو اجلاس نومبر ۱۹۵۹ میں مناکو میں ہوا تھا اس میں بہتیرے ممالک کو امریکہ اور برطانیہ پر یہ سخت اعتراض تھا کہ وہ انہیں گہرے سمندروں میں پھینکتے ہیں۔ اسی سبب سے کوئی اتفاقِ رائے نہ ہو سکا۔ زیادہ اثرات کے حامل اجزا تو سمندروں میں جاتے ہیں اور کم اثرات والے دریاؤں میں یا پھر براہ راست زمین میں جہاں وہ آہستہ آہستہ زمین کے

پانی میں جذب ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے تمام یا جزوی ریڈیائی اثرات خواہ کیمیائی طور پر یا طبیعیاتی طور پر زمین کو دیے دیتے ہیں۔

سب سے بڑے پیمانے کی ناکارگی تو خود اس ایٹمی ری ایکٹر کی ہوگی جو کام کرنے کے قابل نہ رہے گا۔ چھوٹے موٹے معاشی مسائل پر تو لمبی چوڑی معاشی بحثیں ہوتی رہتی ہیں کہ ری ایکٹر بیس سال چلے گا یا پچیس یا تیس سال تک مگر اس انسانی مسئلے پر کوئی بحث نہیں ہوتی کہ انہیں نہ تو ڈھایا جا سکتا ہے اور نہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ وہ وہیں کھڑے رہیں گے جہاں ہیں سینکڑوں سال، شاید ہزاروں برسوں تک، زندگی کے لیے مستقل طور پر مضرت رساں، بڑی خاموشی سے ریڈیائی اثرات ہو، خ پانی اور زمین کو منتقل کرتے ہوئے۔ کسی شخص نے بھی ان شیطانی کارخانوکس کی تعداد اور مقامات کے بارے میں غور نہیں کیا جو بلا جھجک بڑھتے رہیں گے۔ زلزلے نہیں آئیں گ۔ نہ جنگیں ہوں گی، نہ فسادات ہوں گے لیکن یہ ناکارہ ایمٹ ۔یپاور سٹیشن بے ڈھب یادگار کے طور پر ہمیشہ کھڑے رہیں گے اور انسان کے اس مفروضے کو جھٹلاتے رہیں گے کہ اب سکون کا سیدھا راستہ ہمارے سامنے ہے یا یہ کہ مستقبل حال کے اس معمولی فائدے کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

بہرحال ہمارا مطمحِ نظر یہ ہے کہ ''ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال'' نیب ڑے سخت خطرات کو جنم دیا ہے جن سے محض آج کے زندہ لوگ ہی متاثر نہیں ہو رہے ہیں بلکہ آئندہ نسلیں بھی ان کی زد میں ہیں جب کہ ابھی ہم ایٹمی توانائی کو، اعداد و شمار کے مطابق انتہائی قلیل مقدار میں صرف کر رہے ہیں۔ اصل ترقی تو اب شروع ہونے والی ہے جو اتنی بڑی سطح پر ہوگی کہ بہت کم لوگ اس کا تصور بھی کر سکیں گے۔ اگر واقعی ایسا ہوا تو نقل و حمل کا ایک مستقل سلسلہ جاری ہو جائے گا۔ ریڈیائی مواد کی باعمل کیمیائی پلانٹ سے ایٹمی سٹیشن کی طرف آمد و رفت ہوگی۔ پھر سٹیشن سے ناکارگی کا اخراج کرنے والے پلانٹ کی طرف اور پھر وہاں سے ناکارہ مواد کو ضائع کرنے والے مقامات کی طرف۔ اس طرح نقل و حمل کے دوران میں یا پیداواری عمل کے دوران میں کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے جس سے بڑے پیمانے پر تباہی ممکن ہے۔ علاوہ ازیں ساری دنیا میں تابکاری کی سطح نسلاً بعد نسلاً مستقل طور پر بڑھتی جائے گی۔ ان مضر اثرات میں انسانی جسم اور اس کے تمام خواص پر مرتسم ہونے والے ایسے اثرات بھی شامل ہیں جو اعضا، ان کی کارکردگی اور اجزائے حواس کو تباہ کر سکتے ہیں۔

بڑے بڑے علمائے طلب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایٹمی توانائی کا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ تابکاری حیاتیات میں تحقیقات کی جائیں جو ابھی نہیں ہوئیں۔ مشہور ماہرین طبیعات مصر ہیں ''ایٹمی ری ایکٹر بنانے کے فاتحہ عمل'' کے بجائے مستقبل کے توانائی کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش چھوٹے پیمانے پر کرنی چاہیے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جو فی الحال لاینحل نہیں ہوا ہے۔

تاہم اس قسم کے اہم تصورات اس بحث پر اثر انداز نہیں ہوتے کہ آیا ہمیں فوری طور پر ایٹمی پروگرام پر عمل درآمد کرنا چاہیے یا ابھی کچھ دن اور رویاتی ایندھن پر گزر اوقات کرنی چاہیے جو بہرص ورت ہمیں کسی عجیب وغریب اور بے حد وشمار خطرے سے دو چار نہیں کرتے۔ تمام بحث، جس کا تعلق حیاتِ انسانی کے مستقبل سے ہے، محض اس تصور کے گرد گھومتی ہے کہ فوری نفع کس بات میں ہے۔ جیسے چیتھڑوں اور ہڈیوں کے دوسوداگر قیمت میں رعایت کے مسئلے پر سمجھوتہ کررہے ہوں۔

بھلا دھویں سے گدلی ہونے والیہوا کا ہوا، پانی اور مٹی کی ریڈیائی آلودگی سے کیا موازنہ ہوسکتا ہے؟ یہ بات نہیں کہ میں ہوااور پانی کی روایتی آلودگی کو کمتر بتارہا ہوں۔ تاہم ہمیں ان کے طول ہوعرض کے فرق کو سمجھنا چاہیے۔ ریڈیائی آلودگی وسعت وگہرائی میں ان خطرات سے بہت زیادہ ہے جن سے اب تک انسانیت دوچار ہوچکی ہے۔ کوئی شخص بھی یہ سوال کرسکتا ہے کہ صاف وشفاف ہوا کا تقاضا اس صورت میں بے معنی ہوگا اگر ہوا میں ریڈیائی اجزا شامل ہوں۔ اور اگر ہوا کو محفوظ رکھا بھی جاسکے تو بھی اس کا کیا فائدہ اگر مٹی اور پانی میں ریڈیائی زہر مل رہا ہو۔

کوئی معاشیات دان بھی یہ سوال کرسکتا ہے کہ آخر ایسی معاشی ترقی کا کیا فائدہ، ایسے اعلیٰ معیار زندگی کے کیا معنی جب یہ سرزمین اس طرح زہر آلود ہو کہ اس کے اثر سے ہماری اولادیں اور اولادوں کی اولادیں جسمانی بدوضعی کا شکار ہوجائیں؟

ایک امریکی سائنسدان، نیوکلیر طبیعیات کے ماہر اے۔ ڈبلیو۔ وائن برگ کا خیال ہے کہ ''فی زمانہ اچھی نیتیوں کے انسانوں میں ایک قابل فہم تحریک ایٹمی توانائی کے مثبت پہلوؤں کے جتانے کی جانب ہے، محض اسلیے کہ اس کے منفی پہلو نہایت تکلیف دہ ہیں۔'' تاہم وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''ایسی بہت سی ذاتی مجبوریاں ہیں جن کے باعث ایٹمی سائنسدان دنیا کے معاملات پر اپنے اثرات کے متعلق لکھتے ہوئے رجائیت کے میلانات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو خود اپنی ذات کو ایٹمی تباہیوں کے ذرائع سے منلک رہنے کا جواز مہیا کرنا پڑتا ہے۔

(یہاں تک کہ ہم ری ایکٹر والے لوگ بھی اپنے ہتھیاروں والے ساتھیوں کے مقابلے میں کچھ ہی کم احساس جرم کا شکار رہتے ہیں)۔

یہاں ہم یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ ہماری خود کو قائم کرنیکی جبلت ہی ہمیں احساس جرم کی حامل رجائیت یا معاشی نفع کی غیر تصدیق شدہ توقعات سے آزاد رکھ سکتی ہ۔ ایک امریکی مبصر نے ی رائے دی ہے کہ ''ہمارے لیے ابھی یہ موقع ہے کہ ہم اپنے پرانے فیصلوں پر دوبارہ غور کریں اور از سر نو نئے فیصلے کریں۔ کم از کم اس وقت تو ہمارے سامنے انتخاب کی راہ کھلی ہوئی ہے۔'' جب ریڈیائی اثرات پیدا کرنے والے بہت سے مراکز کھل جائیں گے تو پھر انتخاب کی گنجائش باقی نہیں رہے گی خواہ ہم خطرہ کا مقابلہ کرسکیں یا نہ کرسکیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی باتیں کرنے کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ ہم سائنس، ٹیکنالوجی اور ترقی کے مخالف ہیں۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے بغیر انسانی زندگی ایسی ہی ہوگی جیسے قوانین فطرت کے خلاف جینا، البتہ یہ سوچنا ضروری ہے کہ سائنسی تحقیقات کی سمت کیا ہو۔ مگر یہ بات محض سائنسدانوں پر نہیں چھوڑی جاسکتی۔ خود آئن سٹائن کا خیال ہے کہ ''تقریباً تمام سائنس دان معاشی لحاظ سے مکمل طور پر زیر بار ہیں'' اور ''ایسے سائنسدانوں کی تعداد بہت کم ہے جن میں معاشرتی ذمہ داریوں کا احساس ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تحقیق کی سمت کا تعین نہیں کرسکتے۔ عوام میں ایسے خیالات کو فروغ دے کر ہی سیاستدانوں کو، جو عوام کو نمائندے ہوتے ہیں، معیشت کے سحر سے آزاد کیا جاسکتا ہے اور انہیں ان کاموں پر لگایا جاسکتا ہے جن کی واقعی اہمیت وضرورت ہے۔ سائنسی تحقیق کی سمت تشدد کے بجائے عدم تشدد کی طرف ہونی چاہیے۔ فطرت سے جنگ کے بجائے فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کے تعلق کی طرف ہونی چاہیے سکون، معتدل توانائی، لطافت اور ایسے معاشی حل کی طرف ہونی چاہیے جو فطرت سے ہم آہنگ ہوسکے، بجائے اس کے کہ پرشور، غیر معتدل توانائی، سفاکی، بربادی اور ایسے بے ہنگم حل کی طرف ہو جیسا کہ آج کی سائنس کا وطیرہ ہے۔

MashalBooks.com

ٹیکنالوجی کا انسانی چہرہ

جدید دنیا کی تشکیل اُسی مابعد الطبیعیات سے ہوئی جس سے اس کا تعلیمی نظام پیدا ہوا اور جس کے باعث اس کی سائنس اور ٹیکنالوجی نے ترقی کی لہٰذا اب مابعد الطبیعیات اور تعلیم سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید دنیا کی تشکیل ٹیکنالوجی نے کی ہے۔ آج کی صورت حال یہ ہے کہ دنیا یکے بعد دیگرے بحران سے گزر رہی ہے، ہر چہار سمت تباہی کی پیش گوئیاں ہو رہی ہیں اور فی الواقع شکست و ریخت کے آثار نمایاں ہیں۔ ٹیکنالوجی کی پیدا کردہ بیماری اس بات کی متقاضی ہے کہ اس پر از سر نو غور کیا جائے۔ اگر یہ روز بروز غیر انسانی صورت میں ڈھلتی جا رہی ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ انسانی چہرے والی ٹکینالوجی پیدا کی جائے؟

یہ عجیب بات ہے کہ وہ ٹیکنالجی، جسے انسان نے پیدا کیا ہے، اب پانے قوانین اور اصولوں کے تابع ہو کر خود بخود پنپ رہی ہے اور یہ اصول و قوانین نہ تو انسانی فطرت کے مطابق ہیں اور نہ عام فطرت کے۔ فطرت کو معلوم ہے کہ کہاں رُک جانا ہے۔ فطری نمو سے زیادہ تعجب خیز چیز فطرت کا خود بخود ٹھہر جانا ہے۔ فطرت میں طول و عرض، رفتار، شدت، ہر شے کا ایک پیمانہ ہوتا ہے جس ک نتیجے میں پورا نظام فطرت، جس میں انسان بھی شامل ہے، بذاتہی توازن، ہم آہنگی اور صفائی کے اصولوں کے تابع ہے۔ لیکن ٹیکنالوجی کا معاملہ مختلف ہے یا یوں کہیے کہ ایسے شخص کا جس پر ٹکنالوجی اور تخصیص حاوی ہو، معاملہ جدا ہے۔ ٹکنالوجی میں کوئی حد بندی نہیں ہوتی۔ فطرت کے لطیف نظام میں جدید دنیا کی اعلیٰ ترین ٹکنالوجی خارجی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے اور آج اس بات کی نشانیاں پیدا ہو ہی ہیں کہ فطرت اُسے رد کر رہی ہے۔

جدید دنیا تین بحرانوں سے بیک وقت گزر رہی ہے: پہلا یہ کہ انسانی فطرت ٹکنیکی، تنظیمی اور سیاسی اداروں سے، جن میں وہ حبس اور کمزوری محسوس کرتی ہے، بغاوت پر آمادہ ہے۔ دوسرا یہ کہ زندہ ماحول، جو انسانی زندگی کا ضامن ہے، دُکھ میں مبتلا ہو کر کراہ رہا ہے اور جزوی شکست و ریخت کی علامات ظاہر کر رہا ہے۔ تیسرا یہ کہ ہر سمجھدار شخص کو یہ معلوم ہے کا نا قابل تجدید قدرتی وسائل کا بے دردی سے استعمال، بالخصوص معدنی ایندھن کا، ہمارے لیے شدید مسائل پیدا کر رہا ہے اور خطرہ یہ ہے کہ مستقبل قریب میں اسکے ذخائر مکمل طور پر ختم ہو جائیں گے۔

Mashalbooks.com

ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ان تینوں میں سے کون سا بحران پورے ڈھانچے کے انہدام کا براہ راست ذمے دار ہوگا تاہم یہ واضح ہے کہ وہ طریق حیات، جس کی بنیاد مادیت پر ہو یعنی محدود ماحول میں مستقل اور لامحدود توسیع پسندی پر، وہ زیادہ عرصے قائم نہیں رہ سکتا نیز یہ کہ جس رفتار سے یہ توسیع پسندی جاری رہے گی اسی رفتار سے زندگی کی توقعات ختم ہوتی جائیں گی۔

ساری دنیا کی طوفن خیز صنعتی ترقی، جو پچھلے تیس چالیس برسوں میں ہوئی ہے، بالآخر ہمیں کہاں لے جارہی ہے؟ مسائل کے حل سے کہیں زیادہ تیز رفتار خود مسائل ہیں۔ اور امیر اور غریب دونوں ملکوں کا حال ایک ہی ہے۔ ہمارے پچھلے تجربات اس بات کی قطعی نشاندہی ہی نہیں کرتے کہ جدید صنعتی ترقی دنیا کی غربت میں کسی قدر کمی کرسکتی ہے۔ بے روزگاری کے مسئلے کا تو ذکر ہی نہیں جو نام نہاد ترقی پذیر ملکوں میں تیس فیصد تک ہے اور اب تو بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی مستقل مسئلہ بنتی جارہی ہے۔ ہمارے سامنے اب یہ سوال ہے کہ کیا ایسی صنعتی ترقی ممکن ہے جو ہمارے لیے واقعی کارآمد ہو یعنی ایسی ٹکنالوجی جو انسانی چہرہ رکھتی ہو؟

ٹکنالوجی کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ انسان کے کام کے بوجھ کو ہلکا کرے تاکہ وہ زندہ رہتے ہوئے اپنے امکانات کو بڑھا سکے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے۔ کسی مشین کو کام کرتے دیکھئے۔ کمپیوٹر کو لے لیجیے۔ وہ کام جو کلرک یا رضای دان خاص مدت میں کریں گے یہ سیکنڈوں میں کرسکتا ہے۔ لیکن جب آپ پورے معاشرے پر نظر ڈالیں تو اس صداقت کو تسلیم کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ دنیا کے سفر میں، جس میں امیر غریب دونوں ممالک شامل ہیں، مجھے معاشیات کا پہلا قانون اس طرح وضع کرنا پڑا: ''کسی معاشرے میں تفریحی اوقات اس کی محنت بچانے والی مشینوں کی مقدار کے متضاد تناسب میں ہوتے ہیں۔'' معاشیات کے پروفیسروں کو چاہیے کہ امتحان کے پرچوں میں طالب علموں سے اس مفروضے پر بحث کرائیں۔ سہولت پسند انگلستان سے چل کر آپ جرمنی یا امریکہ کی طرف جائیں تو پتا چلے گا وہاں کے لوگ زیادہ تناؤ میں زندگی بسر کرتے ہیں اور اگر آپ برما چلے جائیں، جو صنعتی ترقی کے حوالے سے سب سے نچلی سطح پر ہے، تو معلوم ہوگا کہ وہاں کے لوگوں کے پاس تفریحی اوقات بہت زیادہ ہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ ان کے پاس مشینیں کم ہیں اس لیے وہ اتنا کچھ نہیں کر پاتے جتنا ہم کرتے ہیں لیکن یہ مسئلہ دوسرا ہے، اصل بات یہ ہے کہ ان کے کندھوں پر زندگی کا بوجھ اتنا ہی ہے جتنا ہمارے کندھوں پر ہے۔

ٹکنالوجی فی الحقیقت ہمارے ساتھ کیا کرتی ہے، اس کی چھان بین ہونی چاہیے۔ یہ بعض

کاموں کو کم لیکن بعض کو بڑھا دیتی ہے۔ جدید ٹکنالوجی جس کام کو کم کرتی ہے، اس کا تعلق انسانی ہاتھوں کی ہنرمندانہ پیداوار سے ہوتا ہے۔ ایسی پیداوار میں انسانی ہاتھ کسی نہ کسی قسم کے مواد سے براہ راست متعلق ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ صنعتی معاشرے میں اس قسم کا کام بالکل نایاب ہے اور اس طرح کے کام سے اچھی زندگی بسر کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔ فی زمانہ نیوراتیت کی بڑی وجہ یہی حقیقت ہے۔ ٹامس اکیوناس کی تعریف کے مطابق انسان، دماغ اور ہاتھ رکھنے والا وجود ہے۔ اس کی سب سے بڑی مسرت اس بات میں ہے کہ وہ تخلیقی، افادی، پیداواری طور پر اپنے ہاتھوں اور دماغ دونوں کو کام میں لاتا رہ۔ آج اس سادہ سی بات کے لیے، اس بڑے تعیش کے لیے اُسے بہت دولتمند ہونا چاہیے۔ اُسے اس قابل ہونا چاہیے کہ اس کے پاس جگہ ہو اور اچھے اوزار ہوں۔ اُسے اتنا خوش قسمت ہونا چاہیے کہ لائق استاد مل جائے اور اس کے پاس وقت ہونا چاہیے تاکہ وہ مشق کر سکے۔ اُسے اتنا دولتمند بھی ہونا چاہیے کہ کوئی اور کام کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ اس لیے کہ ایسے کاموں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے جو کسی کو اس قسم کی تسکین بہم پہنچا سکیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں کتنا وقت صحیح قسم کی پیداوار میں صرف ہوتا ہے۔ انگلستان کی آدھی سے کم آبادی کسی نہ کسی پیشے سے منسلک ہے۔ ان میں سے ایک تہائی زراعت، کان کنی، تعمیر تا اور صنعتوں میں پیداواری کا کام سرانجام دیتی ہے۔ میری مراد اصل پیداوار کرنے والوں سے ہے، ان سے نہیں جو صرف حکم چلاتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر کل آبادی کے چھٹے حصے سے بھی کم لوگ اصل پیداوار سے منسلک ہیں۔ اوسطاً ان میں سے ہر ایک اپنے علاوہ دیگر پانچ افراد کا کفیل ہے۔ ان پانچ میں سے دو غیر پیداواری کام کرتے ہیں اور تین برسرکار نہیں۔ وہ ایک شخص، جو پوری طرح برسرکار ہے، تعطیلات، بیماری اور دیگر اقسام کی غیر حاضری کے باعث اپنے ''کل وقت'' کا محض پانچواں حصہ اپنے پیداواری کام میں صرف کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پورے معاشرے کے ''کل وقت'' کا جو حصہ پیداوار پر صرف ہوتا ہے ___ اس مفہوم میں جس میں پیداوار کی اصطلاح کو استعمال کر رہا ہوں ___ وہ پوری آبادی کے نصف کی تہائی کا محض پانچواں حصہ ہے یعنی ساڑھے تین فیصد۔ ساڑھے چھیانوے فیصد وقت دوسرے طریقوں سے صرف ہوتا ہے جس میں سونا، کھانا، ٹیلی وژن دیکھنا، ایسے کام کرنا جو براہِ راست پیداواری نہیں ہیں یا دگر انسانی سطحوں پر وقت کا زیاں سب شامل ہیں۔

ان اعداد و شمار کو امنا و صدقنا کہہ کر قبول نہ کیجیے، اس بات پر غور کیجیے کہ ٹکنالوجی نے ہمیں

کس نہج پر لا کھڑا کیا ہے؟ اس نے ہماری پیداواری اوقات کار کو اتنا کم کر دیا ہے کہ اس کے کوئی معنی باقی نہیں رہے۔ ایسی صورت میں ہمیں اس بات پر متعجب نہ ہونا چاہیے کہ احترام پیداواری کام کرنے والوں کی بجائے ان لوگوں کا ہوتا ہے جو ''کل معاشرتی وقت'' کے ساڑھے چھیانوے فیصد میں غیر پیداواری کام کرتے ہیں۔ عمرانیات کے طالب علموں کے سامنے یہ مفروضہ پیش کرنا چاہیے: ''آج کے صنعتی معاشرے میں لوگوں کا احترام اُن کی اصل پیداوار سے قربت کے ''متضاد تناسب'' سے ہوتا ہے۔''

اس کا ایک سبب اور بھی ہے۔ یہ عمل، جس نے ''کل معاشرتی وقت'' کے صرف ساڑھے تین فیصد حصے کو پیداوار تک محدود کر دیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ اس نہایت کم وقت سے عام انسانی مسرتیں اور عناصر تسکین خارج ہو گئے ہیں۔ لہٰذا تمام حقیقی پیداوار انسانی وجود کو بھرنے کے بجائے اُسے خالی کر رہی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''فیکٹری سے مردہ مواد بہتر صورت پا کر باہر جاتا ہے اور وہاں کام کرنے والا انسان پست اور ذلیل ہو جاتا ہے۔''

اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید صنعت نے انسان وہ تخلیقی و افادی کام چھین لیا ہے جسے وہ اپنے دماغ اور ہاتھوں سے سرانجام دے کر مسرت حاصل کرتا تھا اور اس کے بدلے میں اسے جزوی کام کرنے پڑتے ہیں جن سے وہ مطلق خوش نہیں ہوتا۔ اس نے کثرت سے ایسے انسان پیدا کر دیے ہیں جو ایسے کاموں میں بہت زیادہ مشغول ہوتے ہیں جو پیداواری بھی ہوں تو بالواسطہ یا مبہم طور پر ہی ہوتے ہیں۔ ان کاموں میں بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں کہ اگر صنعت اتنی جدید نہ ہوتی تو شاید انہیں کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کارل مارکس نے ان کی پیش بینی کر لی تھی۔ جبھی تو اس نے یہ لکھا تھا: ''وہ چاہتے ہیں کہ پیداوار کارآمد یزوں تک محدود ہو جائے لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ بہت سی کارآمد چیزوں کا نتیجہ بہت سے بیکار لوگ ہوتے ہیں۔'' مارکس کی اس بات میں ہم یہ اضافہ کر سکتے ہیں: ''ہاں! بالخصوص اس وقت جب عمل پیداوار بے لطف اور بیزار کن ہو''۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جدید صنعت جس طور سے ترقی کرتی آئی ہے، کر رہی ہے اور آئندہ کرے گی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا چہرہ غیر انسانی ہے لہٰذا بہتر ہوگا ہم از سر نو غور و فکر کر کے اپنی منزلوں کا بار دگر تعین کریں۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ جو وقت براہِ راست پیداواری کاموں میں صرف ہوتا ہے وہ کل معاشرتی وقت کا ساڑھے تین فیصد ہے۔ جدید ٹکنالوجی کی کوشش مسلسل یہ ہے ہ اس کو صفر پر لے

آیا جائے۔ تصور کیجیے کہ ہم اپنی سمت کا تعین اس کے برعکس کرلیں اور پیداواری وقت کو چھ گنا بڑھا کر بیس فیصد کرلیں اور یوں اپنے دماغوں، ہاتھوں اور اعلیٰ اوزاروں کو کام میں لائیں تو ایسی صورت میں بچے اور بوڑھے سبھی خود کو کارآمد پائیں گے۔ ہر کام کرنے کے لیے آج بہ نسبت ہمارے پاس چھ گنا زیادہ وقت ہوگا۔ پھر خوشی بھی بڑھ جائے گی، کارکردگی بھی اور قدر اور حسن بھی۔ اب ذرا اس حقیقی کام کی معالجاتی اور تعلیمی قدر کا اندازہ لگائیے۔ اس وقت اس بات کی ضرورت ہی نہ ہوگی کہ سکلو سے نکلنے کی عمر میں اضافہ یا پنشن پانے کی عمر میں کمی کردی جائے تاکہ لوگ بازارِ محنت سے دور رہ سکیں۔ کیا پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اوقاتِ کار میں اضاہ ہو؟ جی نہیں۔ جو لوگ اس طرح کام کرتے ہیں وہ کام اور تفریح میں فرق کرنا نہیں جانتے۔ سونے، کھانے اور کبھی کبھی مطلق کام نہ کرنے کی خواہش کے علاوہ ہمہ وقت خوش دلی اور تخلیقی لگن کے ساتھ کام میں مصروف رہیں گے۔ پھر بے مقصد تفریحوں، سکون آور دواؤں کی ضرورت باقی نہر ہے گی اور یقیناً بیماریاں بھی کم ہوجائیں گی۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک رومانوی اور یوٹوپیائی تصور ہے۔ بالکل ہے۔ آج کی صنعتی معاشرت میں جو کچھ ہے وہ نہ رومانوی ہے اور نہ یوٹوپیائی، اس لیے کہ وہ موجود ہے۔ تاہم وہ جو موجود ہے سخت مشکل میں ہے اور اس کے آئندہ قائم رہنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اگر ہم خود زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اپنے بچوں کو زندہ رکھنا چاہتا ہیں تو ہمیں خواب دیکھنے ہوں گے، ایک نیا طرز حیات اپنانا ہوگا جو انسان کی حقیقی ضروریات کے مطابق ہو، زندہ فطرت، کی صحت کا ضامن ہو اور اس دنیان کو جو وسائل ملے ہیں ان سے ہم آہنگ ہو۔

اسے رحمت الٰہی سمجھیے کہ آج دولتمند ملکوں کے دلوں میں تیسری دنیا کے لیے جگہ پیدا ہوگئی ہے اور وہ ان کی غربت کم کرنے کے بارے میں سوچنے لگے ہیں۔ ان کے ملے جلے مقاصد اور استحصالی اندازِ نظر کی موجودگی کے باوجود میں اس نئی سوچ کو محترم سمجھتا ہوں۔ یہ خود امیر ممالک کے لیے بھی بہتر ہے کیوں کہ غریب ممالک غربت کی وجہ سے ٹکنالوجی کو اختیار نہیں کرسکتے۔ بے شک کبھی کبھی وہ اسے اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے نتیجے میں انہیں عام بیروزگاری، دیہاتوں کی بربادی، شہروں کی طرف لوگوں کی دوڑ اور ناقابل برداشت معاشرتی کھینچاؤ کے مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ دراصل اُنہیں اسی چیز کی ضرورت ہے جس کی ضرورت ہمیں بھی ہے۔ یعنی ایسی ٹکنالوجی کی جس کا چہرہ انسانی ہو، جو انسانی ہاتھوں اور ذہنوں کو عضو معطل

بنانے کی بجائے انہیں اتنا زیادہ تخلیقی بنا دے جتنا کہ وہ پہلے بھی کبھی نہیں تھے۔

دنیا کے غریب عوام کی مدد بڑے پیمانے کی پیداوار سے نہیں کی جا سکتی۔ اس پیداوار سے کی جا سکتی ہے جس میں بڑے پیمانے پر عوام شریک ہوں۔ بڑی بڑی صنعتوں کی بڑے پیمانے پر پیداوار کے معنی محض یہ ہیں کہ آپ امیر ہیں کیوں کہ بڑی صنعت لگانے کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت وتی ہے۔ عوام کے ذریعے پیداوار کے نظام کے معنی یہ ہیں کہ آپ اُن بیش بہا وسائل کا استعمال کر رہے ہیں جو تمام انسانوں کے پاس ہیں یعنی ان کے ہنرمند ہاتھ اور تیز ذہن جنہیں عمدہ قسمکے اوزاروں کی اعانت بھی حاصل ہوگی۔ ایسی صنعت، جدید علم اور تجربے کے ساتھ، ماحول سے مطابقت رکھتے ہوئے وسائل کو احتیاط سے استعمال کرے گی اور بجائے اس کہ انسانوں کو غلام بنائے ان کی خدمت کرے گی۔ اس صنعت کو میں ''اوسط درجے'' کی صنعت کہتا ہوں جو سابات کی علامت ہے کہ وہ قدیم صنعتوں سے تو بدرجہا برتر ہوگی ہی امیر ملکوں کی ''سپر ٹکنالوجی'' کے مقابلے میں بھی زیادہ آسانے زیادہ سستی اور زیادہ آزاد ہوگی۔ اُسے آپ ''خود امدادی'' صنعت بھی کہہ سکتے ہیں یا اس کا نام جمہوری صنعت یا عوامی صنعت بھی رکھ سکتے ہیں کہ اُس تک ہر شخص کی رسائی ممکن ہوگی اور وہ محض دولتمند اور طاقت ور تک محدود نہ رہے گی۔

ہمارے پاس علم تو یقیناً ہے لیکن ایسی صنعت کو پیدا کرنے کے لیے منظّم تخلیقی کوشش کرنی ہوگی۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ سیدھی سادی آسانی پیدا کرنا تکلف اور پیچیدگی پیدا کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ پیچیدگی تو کوئی بھی تیسرے درجے کا انجینئر یا محقق پیدا کر سکتا ہے لیکن چیزوں و سادا بنانے کے لیے بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے، جو حقیقی تخلیقی کاموں سے اور فطرت کے متوازن نظام سے دور ہو گئے ہوں، اس بصیرت کو حاصل کرنا محال ہوتا ہے۔ ایسے عمل، جو حدود کا پابند نہ ہو، شیطانی عمل ہوتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے لیے کام کرتے ہوئے ہمیں ان کی غربت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمارا کام اپنے لیے بھی سبق آموز بن جاتا ہے کہ دوسروں کی مدد کرتے ہوئے ہمیں وہ علم اور تجربہ حاصل ہوتے ہے جس سے ہم خود اپنی مدد بھی کر سکتے ہیں۔

صنعتی ترقی کے پیچھے اندھا دھن بھاگنے والوں نے ساری دنیا کو جس بحرانی صورتِ حال میں ڈال دیا ہے (جس کا ذکر ہم پہلے کرتے آئے ہیں) اس کا مقابلہ محض اسی طور کیا جا سکتا ہے۔ یہ بڑی ہمت کی بات ہے کہ آپ اپنے عہد کے میلانات اور فیشن کو مسترد کر دیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ

ہم پر یہ الزام لگائیں کہ وہ ترقی کے حق میں ہیں اور ہم خلاف ہیں۔ یہ سطحی بات ہے۔ ایک مفہوم میں تو ہر شخص پیداواری ترقی میں یقین رکھتا ہے اور یہ بات صحیح ہے کہ ترقی زندگی کی لازمی خصوصیت ہے۔ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ ترقی کو قدری تعینات میں لایا جائے۔ یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ بعض چیزیں بڑھتی ہیں اور بعض ختم ہو جاتی ہیں۔ جدید ٹکنالوجی کی سمت بڑے سے بڑے سائز، زیادہ سے زیادہ رفتار اور مستقل بڑھتے ہوئے تشدد کی طرف ہے۔ یہ بات آہنگ فطرت کے منافی ہے لہٰذا ترقی کے متضاد ہے۔ یہی وقت جانچ پرکھ کا ہے اور ہماری جانچ پرکھ یہ بتاتی ہے کہ ہم اپنے وجود ہی کو تباہ کر رہے ہیں لہٰذا ہمارا نیا طرز فکر ہمیں یہ یاد دلا رہا ہے کہ حیات انسانی کا مقصد کیا ہے۔

آج تصورات کی اس جنگ میں ہر کس و ناکس کو کسی نہ کسی طور حصہ لینا ہے۔ اسے ہم یہ کہہ کر نہیں ٹال سکتے کہ ''یہ ماہرین کا مسئلہ ہے''۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم ترقی کے پیچھے اندھا دھند بھاگنے والوں کے ساتھ ہیں۔ سیاست کے بارے میں ہر شخص کا یہ عقیدہ ہے کہ اس اہم چیز کو محض ماہرین کی صوابدید پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ آج کی سیاست کا خاص مواد معیشت ہے اور معیشت کا خاص مواد ٹکنالوجی ہے۔ لہٰذا اگر سیاست کو محض ماہرین کے حوالے نہیں کیا جا سکتا تو میشت اور ٹکنالوجی کو بھی ان کے سپرد کر دینا صحیح نہیں ہے۔

عام لوگ بالعموم اس بات کے اہل ہوتے ہیں کہ وہ ماہرین کے مقابلے میں کسی بات کو وسیع تر تناظر میں انسانی نقطہ نظر سے دیکھیں۔ عام لوگوں کی قوت، جو آج بظاہر کمزور معلوم ہوتے ہیں، اس بات میں نہیں ہوتی کہ وہ کوئی نیا کام شروع کریں بلکہ اس بات میں ہوتی ہے کہ وہ اس اقلیت کا ساتھ دیں جس نے کام شروع کر دیا ہے۔ میں یہاں دو ایسی مثالیں پیش کروں گا جو ہمارے موضوع بحث سے متعلق ہیں۔ ایک کا تعلق زراعت سے ہے اور دوسری کا صنعت سے۔

دید زراعت ایسی کیمیائی کھاد کو زمین، پودوں اور جانوروں کے لیے استعمال کر رہی ہے ج زمین کی زرخیزی اور صحت پر ایسے اثرات ڈالے گی جو مستقبل میں مشکوک نوعیت کے ہوں گے۔ جول وگ شکوک کا اظہار کرتے ہیں انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ آج ہمیں ''زہر اور بھوک'' کے درمیان کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ بہت سے ممالک میں ایسے کامیاب کسان موجود ہیں جو کیمیائی کھاد کے استعمال کے بغیر عمدہ فصلیں اُگاتے ہیں۔ پچھلے پچیس برسوں سے ایک ایسی تنظم قائم ہے جو زمین، پودوں، حیوانوں اور انسان کے درمیان حیاتیاتی رشتوں پر تحقیق کر رہی ہے نیز

اپنی تحقیقات سے عوام کو مطلع کرتی رہتی ہے۔ تاہم نہ تو مندرجہ بالا کامیابی کسان اور نہ ہی یہ تحقیقی کام کرنے والی تنظیم اب تک سرکاری سطح پر کسی قسم کی دلچسپی یا اعانت حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکی ہے۔ یہ بات صرف اس لیے ہے کہ ایسے لوگ ''جدید صنعتی ترقی کی رو'' سے الگ ہیں۔ اب اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جدید طرز حیات ہمیں فنا کے گھاٹ اُتار دیے گا تو ہم پر یہ لازم آتا ہے کہ ہم ان مجددین کا نہ صرف یہ کہ مضحکہ نہ اُڑائیں بلکہ عملی طور پر اُن کا ساتھ دیں۔

جہاں تک صنعت کا تعلق ہے اس سلسلے میں ایک گروہ اوسط ٹکنالوجی کیترقی کا خواہاں ہے۔ یہ ایک ایسے مطالعے میں مصروف ہے جس کی غایت لوگوں کو یہ سکھانا ہے کہ اپنی مدد آپ کس طرح کرنی چاہیے۔ اگرچہ اس گروہ کا بنیادی کام تیسری دنیا کے ممالک کی ٹکنیکی امداد کرنا ہے لیکن اس کی تحقیقات کے نتائج سے وہ لوگ بھی دلچسپی لے رہے ہیں جو دولتمند معاشروں کے مستقبل کے بارے میں ہراساں ہیں۔ یہ گروہ یہ ثابت کر رہا ہے کہ اوسط ٹکنالوجی، ایسی ٹکنالوجی جس کا چہرہ انسانی ہو، ممکن الحصول ہے۔ اس قسم کی ٹکنالوجی انسانی ذہن اور ہنر مند ہاتھوں کی تخلیقی کارگزاریوں کے ذریعے تمام انسانوں میں یگانگت پیدا کرسکتی ہے۔ زمین سے متعلق تنظیم کی طرح اوسط ٹکنالوجی کی تنظیم بھی نجی ادارہ ہے اور اس کا انحصار بھی عوام کی تائید پر ہے۔

مجھے کوئی شبہ نہیں کہ صنعتی ترقی کو ایکنئی سمت سے روشناس کرانا ممکن ہے۔ ایسی سمت جو اسے انسانوں کی اصل ضروریات کی طرف لے جائے۔ اس بات کے یہ معنی بھی ہوں گے کہ اس کی انسانوں کے صحیح قد و قامت کے ساتھ مطابقت ہوگی۔ چونکہ آدمی کوتاہ ہے اس لیے چھوٹائی خوبصورت ہے۔ دیوقامتیت کی تلاش تباہی کی تاش ہے۔ سوال یہ ہے کہ نئے شعور کی کیا قیمت ادا کرنی ہوگی؟ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اپنی بقا کی قیمت کا تعین بے ہودہ سی بات ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر قابل قدر چیز کی کوئی نہ کوئی قیمت ضرور ادا کرنا ہوتی ہے۔ ٹکنالوجی کو اس راہ پر ڈالنا کہ یہ انسان کو تباہ کرنے کی بجائے اس کی خدمت پر مامور ہو جائے بنیادی طور پر تخیلاتی کاوش اور بے خوفی کا کام ہے۔

تیسری دنیا

چند سال پہلے بیرونی امداد سے متعلق برطانوی فراس ایض میں مقاصد کا بیان اس طرح کیا گیا:

''ترقی پذیر ممالک کے لیے حتی المقدور ایسی امداد بہم پہنچانا جس سے وہاں کے عوام کو ایسے مادی مواقع حاصل ہو جائیں جن کی مدد سے وہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال میں لاتے ہوئے بھرپور خوش وخرم زندگی بسر کرسکیں اور تیزی سے اپنے خیالات کو بہتر بنا سکیں۔''

شاید آج اتنی رجائی زبان کا استعمال نہ ہو سکے لیکن بنیادی فلسفہ اب بھی وہی ہے۔ البتہ اس سلسلے میں توقعات کسی حد تک پوری نہ ہوسکیں۔ کام توقع سے زیادہ سخت نکلا اور نئے نئے آزاد ہونے والے ممالک بھی یہی محسوس کر رہے ہیں۔ دو باتیں ایسی ہیں جن سے دنیا بھر کو تشویش ہے: لاتعداد بے روزگاری اور بے شمار لوگوں کی شہروں کو ہجرت۔ دو تہائی انسانیت کے لیے ''بھرپور خوش وخرم زندگی'' کا مقصد اور ان کے حالات کی تیزی سے بہتری آج بھی اتنی ہی دور ہے جتنی پہلے تھی لہٰذا ہمیں سارے مسئلے کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔

بہت سے لوگ، جو نئے طرز پر سوچتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ امداد بہت کم ہے۔ وہ یہ تو مانتے ہیں کہ بہت سے میلانات غیر صحت مندانہ اور مناقشانہ ہیں لیکن یہ سمجھتے ہیں کہ اگر امداد کافی بڑھ جائے تو ان خرابیوں کی تلافی ہوسکتی ہے۔

تقریباً تمام ترقی پذیر ممالک میں ایک غیر صحت مند اور پرآشوب میلان نمایاں ''دوغلی معیشت'' کا ہے جس میں زندگی کے دو متضاد نمونے اس طرح اُبھرے ہیں جیسے دو مختلف دنیائیں۔ یہ بات نہیں کہ کچھ امیر ہیں اور کچھ غریب اور دونوں مشترک طرز حیات کے حامل ہیں۔ یہ دو مختلف طریق زیست ہیں جو ساتھ ساتھ چل رہے ہیں جس میں ایک کا ادنیٰ ترین فرد اپنی روزانہ آمدنی کا وہ حصہ خرچ کرتا ہے جو دوسرے کے سخت ترین محنت کرنے والے شخص کی آمدنی سے بیسیوں گنا زیادہ ہوتا ہے۔ اس ''دوغلی معیشت'' سے پیدا ہونے والی معاشرتی اور سیاسی کشاکش اتنی واضح ہے کہ اس کا بیان غیر ضروری ہے۔

MashalBooks.com

کسی ترقی پذیر ملک میں، جس میں اس ''دوغلی معیشت'' کا رواج ہے۔ کم و بیش پندرہ فیصد آبادی ایک دو بڑے شہروں میں کھپ جاتی ہے۔ باقی ماند پچاسی فیصد دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں بستے ہیں۔ زیادہ تر ترقیاتی کام بڑے شہروں میں ہوتے ہیں لہٰذا پچاسی فیصد آبادی سے بالعموم قطع نظر کرلیا جاتا ہے۔ یہ فرض کرلینا کہ شہروں کی جدید معیشت ترقی کرتے کرتے بالآخر ساری آبادی پر محیط ہو جائے گی حقیقت کی غلط تفہیم ہے۔ آج امیر ترین ممالک بھی شہروں میں آبادی کے بوجھ تلے کراہ رہے ہیں۔

جدید افکار کے ہر شعبے میں ''ارتقا'' کا تصور مرکزی کردار ادا کر رہا ہے لیکن ''ترقیاتی معیشت'' کے شعبے میں ایسا نہیں ہے حالانکہ لفظ ''ترقی'' اور لفظ ''ارتقاء'' ایک دوسرے کے مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ ذرا تصور کیجیے کہ ہم کسی جدید صنعتی ادارے مثلاً ریفائنری کو دیکھنے آئے ہیں۔ اس کی وسعت، اس کی حیرت ناک پیچیدگی کے پیش نظر ہم یہ سوچنے لگے ہیں کہ آخر انسانی ذہن میں اس کا تصور کیسے آیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اسے یک بیک کسی انسان نے نہیں سوچا۔ یہ محض ارتقائی عمل کے ذریعے وجود میں آیا۔ اول اول تو اس کی ابتدا سیدھی سادی مشینوں سے ہوئی۔ پھر اُس میں ترمیم کی گئی اور اس طرح یہ سارا ڈھانچہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا گیا۔

تاہم ہم نے اپنی سیر میں جو کچھ دیکھا وہ اس سے بہت کم ہے جو ہم نے نہیں دیکھا۔ وہ طویل طویل پیچیدہ انتظامات جن کے ذریعے خام تیل ریفائنری میں جاتا ہے اور وہاں سے تتھری ستھری مختلف اقسام کی پیداوار مختلف پیکنگ اور لیبل کے ساتھ باہر آتی ہیں اور لاتعداد صارفین میں ایک خاص نظام کار کے حوالے سے تقسیم ہوتی ہیں۔ یہ تمام باتیں ہم دیکھ نہیں سکتے۔ نہ ہی ہم منصوبہ بندی، ادارتی تنظیم، سرمایہ کاری اور مارکیٹنگ کے نظام کے پس منظر میں موجود دانش مندانہ کارگزاریوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ہم اس تعلیمی پس منظر کو بھی نہیں دیکھتے جو ان تمام کارگزاریوں کے لیے بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ پرائمری سکولوں سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک اور پھر خصوصی تحقیقی مراکز ___ ان سب کے بغیر جو کچھ ہمیں دکھائی دیتا ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ہمارا جدید میلان یہ ہے کہ ہم محض اُسی چیز کا شعور رکھتے ہیں جو اوپر سے دکھائی دے اور ان چیزوں کا مطلق خیال نہیں رکھتے جو پس منظر میں رہتے ہوئے دکھائی دینے والی چیزوں کے وجود کو ممکن بناتی ہیں اور انہیں بروئے کار رکھتی ہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ امداد کی ناکامی یا اس کے اثرات کے بارے میں ہماری مایوسی کا تعلق

اس مادی فلسفے سے ہے جس کے باعث ہم کامیابی کے ان اہم اور بنیادی عناظر کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ہمیں اوپر سے دکھائی نہیں دیتے۔ اور اگر ہم انہیں بالکل نظر انداز نہیں کرتے تو کم از کم انہیں اسی طرح برتتے ہیں جیسے مادی اشیا کو ___ ایسی اشیا جنہیں منصوبے کے مطابق پیسوں سے خریدا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہم ترقی کو ارتقاء کے مفہوم میں نہیں بلکہ تخلیق کے مفہوم میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہمارے سائنسدان یہ بتاتے رہتے ہیں کہ ہمارے گرد و پیش ہر شے فطری پر چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کے باعث ارتقاء پذیر رہتی ہے۔ وہ تو خود خدا کو بھی کسی پیچیدہ تخلیق کا ذمہ دار قرار نہیں دیتے۔ ان کا کہنا ہے کہ پیچیدگی تو ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔ تاہم ہماری ترقیاتی منصوبہ بندی کے ماہرین یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قدرت پر بھی فضیلت رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنی منصوبہ بندی کے ذریعے وہ یک لخت انتہائی پیچیدہ چیزیں پیدا کر سکتے ہیں۔

یہ ممکن ہے قدیم معاشرت کے سیلاب کے درمیان جدید ترین طرز حیات کے چھوٹے چھوٹے جزیرے بنا لیے جائیں لیکن پھر ضرورت اس بات کی ہوگی کہ ان جزیروں کا تحفظ کیا جائے اور انہیں باہر سے ہیلی کاپٹروں کے ذریعے غذا اور دیگر سامان پہنچایا جائے ورنہ چاروں طرف کا سیلاب انہیں بہا لے جائے گا۔ اب خواہ وہ بہتر صورت میں ہیں یا بدتری پیدا کریں بہرحال دوغلی معیشت ضرور پیدا کریں گے۔ انہیں گرد و پیش کی معاشرت میں ضم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

اس قسم کے حالات بعض امیر ملکوں میں بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ یہاں حالات برعکس ہیں کہ بڑے بڑے شہروں کے درمیان، دولت اور امارات کے درمیان غربت اور افلاس کے مارے ہوؤں کو چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔

ابھی تک ترقیاتی منصوبہ بندی کے ماہرین نے ''دوغلی معیشت'' اور اس کی دوگونہ برائیوں یعنی عام بیروزگاری اور شہروں کی طرف عام دوڑ کا کم ہی ذکر کیا ہے۔ لیکن جب بھی کیا افسوس سے کیا البتہ اُسے محض عبوری حالت سمجھا۔ اب اس بات کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ محض وقت ہی اس زخم کا مرہم نہیں ہے۔ اگر اس صورت حال کا مقابلہ شعوری طور پر نہ کیا جائے تو طرفین ایک دوسرے ہلاک کر دیں گے۔ شہروں کی کامیاب صنعتی ترقی دیہی کے معاشی ڈھانچے کو تباہ کر دے گی اور دیہی علاقے اس کا انتقام اس طرح لیں گے کہ وہ شہروں کی طرف ہجرت کر کے وہاں

بدنظمیاں پیدا کریں گے اور وہاں کی زندگی میں زہر گھول دیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پذیر ممالک کے لیے ایسے جدید مراکز قائم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں جہاں سے وہ امیر ممالک سے براہِ راست منسلک ہوتے ہیں۔ قابل اعتراض بات اُن کش یہ مفروضہ ہے کہ ایسے جدید مراکز کو اتنا پھیلایا جاسکتا ہے کہ وہ ملک کی تمام تر آبادی کا احاطہ کرلیں، نیز کہ یہ کام تیزی سے ہوسکتا ہے۔ پچھلے تیس چالیس برسوں سے ترقی کا فلسفہ یہ رہا ہے کہ ''امیروں کے لیے جو کچھ بہتر ہے وہی کچھ غریبوں کے لیے بھی بہتر ہے''۔ اس تصورپ ر بہت تیزی سے عمل کیا گیا ہے۔ اس کا ثبوت بہت سے ترقی پذیر ممالک مثلاً تائیوان، جنوبی کوریا، فلپائن، ویت نام، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، ایران، ترکی، پرتگال، وینزویلا ہیں، جہاں بیشتر امریکہ اور اس کے حلیفوں نے اور بعض جگہ روس نے ''پراُمن مقاصد کے لیے ایٹمی ری ایکٹر نصب کیے ہیں۔ ان تمام ممالک کا بنیادی مسئلہ زراعت اور دیہی زندگی کا فروغ ہے جہاں ان کے مفلس عوام کی اکثریت رہتی ہے۔

اصل مسئلہ تو غربت کا ہے جو انسانیت کو مسخ کردیتی ہے۔ مزید برآں ہمارا سطحی مادی فلسفہ ہمیں محض ''مادی مواقع'' کی شکل دکھاتا ہے۔ (قرطاس ابیض کے الفاظ جن کا ذکر ہو چکا ہے) یہ غیر مادی حقائق سے نظر کرلیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ غربت کے مادی اسباب محض ثانوی حقیقت رکھتے ہیں: مثلاً قدرتی وسائل اور سرمایے کی کمی وغیرہ کی حیثیت ضمنی ہے۔ غربت کے اصل اسباب غیر مادی ہیں یعنی تعلیم، تنظیم اور اداروں کی کمی۔

ترقی ساز وسامان سے شروع نہیں ہوتی۔ وہ تعلیم، اداروں اور نظم وضبط سے شروع ہوتی ہے۔ ان کے بغیر تمام وسائل پوشیدہ اور دوراز کار ہوتے ہیں۔ ہم نے جنگ عظیم کے بعد یہ دیکھا ہے کہ ایسے ممالک، جن میں تعلیم، اداروں اور تنظیم کی سطح بلند تھی۔ خواہ وہ کتنے ہی برباد ہو چکے تھے، معاشی ''معجزوں'' کے حاصل ہوئے۔

لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ غربت کو دور کرنے کے لیے ان غیر مادی وسائل سے کام لینا ہوگا۔ ان تینوں غیر مادی کمیوں کو دور کرنا ہوگا۔ اس امر میں تدریجی ارتقاء کی ضرورت ہے۔ تعلیم محض پھلانگ جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک لطیف تدریجی عمل کا نام ہے۔ ادارے بھی یک لخت وجود میں نہیں آتے۔ ان میں حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ مسلسل ارتقائی عمل جاری رہتا ہے۔ یہی بات تنظیم کے لیے بھی صحیح ہے۔ ان تینوں چیزوں کو محض مختصر اقلیت کی جاندان نہیں

ہونا چاہیے، انہیں پوری قوم کی ملکیت بننا چاہیے۔

ترقی پذیر ممالک کے لیے بیرونی امداد صرف اسی وقت سودمند ہوسکتی ہے جب وہ تعلیم و تنظیم اور اداروں کے فروغ کے باعث ہو مگر یہ عمل بتدریج پھیلاؤ کا ہے، پھلانگ کا نہیں ہے۔ اگر ایسی نئی پالیسیاں بروئے کار لائی جائیں جن کی بنیاد ''مخصوص تنظیم'' پر ہو، جو معاشرتی فضا سے ہم آہنگ نہ ہو تو اس عمل سے صحت مند ترقی کے رجحانات کے بجائے برعکس اثرات پیدا ہوں گے۔ اس طرح ''دوغلی معیشت'' کو ہی تقویت ملے گی۔

لہٰذا اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ ترقی کا مسئلہ محض ماہرین معیشت کا مسئلہ نہیں، بالخصوص ان ماہرین کا جن کے تجزیے کی بنیاد ہی سطحی مادی فلسفے پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان ماہرین کی، خواہ ان کا تعلق کسی نقطہ نظر سے ہو، ترقیاتی عملکے کسی خاص نقطے پر ضرورت ہو، وہ بھی مخصوص ٹکنیکی مسائل سے متعلق، تاہم یہ ضروری ہے کہ تمام تر آبادی کے متعلق ترقیاتی منصوبہ بندی کے بنیادی خطوط پہلے سے متعین ہو چکے ہوں۔

امداد اور ترقیات سے متعلق نئے تصورات کا مطلب یہ نہیں کہ ''جو کچھ امیروں کے لیے بہتر ہے وہی غریبوں کے لیے بھی بہتر ہے۔'' ان تصورات کو عوام اور غربت کے مسائل سے سنجیدگی سے نپٹنا ہے۔ عوام ہی ہر قسم کی دولت کا بنیادی سرچشمہ ہیں۔ ان سے درگذر کر کے کوئی نتیجہ خیز حل سامنے نہیں آسکتا۔

اگلے باب میں ہم اس مقالے کے متن کو اختیار سے پیش کر رہے ہیں جو لاطینی امریکہ کی ترقیاتی منصوبہ بندی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے استعمال کے متعلق یونیسکو کی جانب سے ۱۹۶۵ء میں منعقدہ سنٹیاگو کانفرنس میں پیش کیا گیا۔ وہاں اس کا تصور کا، کہ جدید ترین ٹیکنالوجی لاطینی امریکہ کی موجودہ صورتِ حال میں مناسب کردار ادا نہیں کرسکتی، مذاق اُڑایا گیا۔ تاہم اسی مقالے کی بنیاد پر لندن میں ''اوسط ٹیکنالوجی ترقیاتی گروپ'' معرضِ وجود میں آیا۔

MashalBooks.com

معاشرتی اور معاشی مسائل

''اوسط ٹکنالوجی'' کی ترقی کی ضرورت

دنیا میں مختلف مقامات پر غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔ بیرونی امداد اور ترقیاتی منصوبہ بندیاں اس میلان پر قابو نہیں پا سکتیں۔ فی الحقیقت یہ میلان بڑھ رہا ہے کہ مجبوروں کی مدد کے مقابلے میں ان کی امداد زیادہ آسان ہے جو اپنی مدد آپ کر سکتے ہیں۔ تمام ترقی پذیر ملکوں میں ایک جدید سیکٹر موجود ہے جہاں طرزِ زندگی ہے اور جہاں طرزِ زندگی محض غیر تسلی بخش ہی نہیں بلکہ تباہی کی سمت تیز گام ہے۔

میرے پیش نظر اس دوسرے سیکٹر کے مسائل ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جدید سیکٹر میں تعمیر یکام بند ہو جائے۔ وہ تو بہر حال جاری ہی رہے گا لیکن یہ ضرور ہے کہ جدید سیکٹر کی کامیابیاں بہر صورت محض فریب نگاہ رہیں گی جب تک غریب اکثرت کی صورت حال میں صحت مندانہ استحکام پیدا نہ ہوا اس وقت انتہائی بدحالی کا شکار ہے۔

اوسط ٹکنالوجی کی ضرورت

غریبوں کی صورت حال:

نام نہاد ترقی پذیر ممالک میں غریبوں کے لیے روزگار کے مواقع اتنے محدود ہیں کہ وہ اپنی بدحالی سے باہر نہیں نکل سکتے۔ یا تو ان کے پاس کم آمدنی کے روزگار ہیں یا وہ مکمل بے روزگاری کا شکار ہیں۔ اور جب کبھی انہیں کام مل بھی جاتا ہے تو ان کی پیداواری صلاحیت انتہائی کم ہوتی ہے۔ بعضوں کے پاس زمینیں ہیں لیکن انتہائی قلیل، زیادہ بغیر زمین کے ہیں جنہیں زمین ملنے کی آئندہ بھی کوئی امید نہیں۔ دیہی علاقوں سے مایوس ہو کر وہ شہروں کی طرف بھاگتے ہیں لیکن وہاں بھی اُنہیں روزگار نہی ملتا۔ مل بھی جائے تو گھر نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود وہ شہروں کی جانب بھاگتے ہیں کہ وہاں روزگار کے مواقع دیہاتوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتے ہیں۔

MashalBooks.com

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دیہاتوں میں بے روزگاری کا سبب آبادی میں اضافہ ہوتا ہے لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ زیادہ آبادی کے لیے زیادہ کام کیوں نہیں نکالا جاسکتا۔ جواب یہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا لیکن ''سرمایہ'' کیا ہے؟ یہ بھی تو انسانی کارکردگی سے پیدا ہوتا ہے۔ سرمائے کی کمی پیداوار کی کمی کی وضاحت تو کرسکتی ہے لیکن یہ کارکردگی کے مواقع کے عدم وجود کی وضاحت نہیں کرسکتی۔

اصل بات یہ ہے کہ زیادہ لوگ کام نہیں کرتے اور کرتے ہیں تو وقفے وقفے سے۔ یہی وجہ ان کی غربت کی ہے، پس مایوسی کی حالت میں وہ تلاشِ روزگار میں بڑے شہروں کا رُخ کرتے ہیں۔ دیہی بے روزگاری شہری بے روزگاری کو بڑھاتی ہے۔

جنہیں امداد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے:

بڑے شہروں کو چھوڑیے، سوال یہ ہے کہ اُن قصبات اور دیہاتوں کی معاشی حالت کی درستی کے لیے کیا کرنا چاہیے جہاں ملک کی اسی سے نوے فیصد آبادی رہتی ہے۔ جب تک صرف بڑے شہروں میں صنعتوں کو ترقی ملتی رہے گی جہاں صنعتیں قائم کرنا، منیجروں اور کارکنوں کو تلاش کرنا اور انہیں چلاتے رہنے کے لیے سرمائے اور مال کی کھپت کے لیے منڈیوں کی فراہمی نسبتاً آسان ہوگی اس وقت تک یہ ملک کے دیگر حصوں میں قائم صنعتوں کے مقابلے کے ذریعے تباہ کرتی رہیں گی۔ یوں زیادہ بے روزگاری بڑھے گی اور قصبات کے غریب عوام شہروں کی طرف بھاگیں گے جہاں ان کی کھپت نہ ہوگی اور مسائل میں مزید اضافہ ہوگا۔ گویا ''ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کا عمل'' جاری رہے گا۔

لہٰذا یہ امر ضروری ہے کہ کم از کم ترقیاتی منصوبوں کا ایک حصہ بڑے شہروں کو درگذر کرکے دیہی علاقوں اور چھوٹے قصبات میں ''زراعتی صنعتوں'' کی تنصیبات پر توجہ دیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں چھوٹی چھوٹی کارگاہیں بنائی جائیں جہاں بنیادی زور اس بات پر ہو کہ بے روزگاروں کو کام مہیا کرنا ہے نہ کہ اس بات پر کہ فی کس کارکردگی بڑھانا ہے۔ غریب آدمی کے لیے سب سے زیادہ اہمیت کام ملنے کی ہے۔ کم تنخواہ یا کم تر درجے کا پیداواری کام بے کاری سے بہت بہتر ہے۔

ایسے معاشی اعداد و شمار، جو پیداوار کی مقدار اور آمدنی کی زیادتی کے حوالے سے معاشی

عمل کا محاسبہ کرتے ہیں، ایسی صورت حال میں بے کار ہیں۔ ترقیاتی مسائل کی تفہیم کا یہ طریق کار جامد نقطہ نظر کا حامل ہے۔ حرکی نقطہ نظر کا تعلق عوام کی ضروریات اور ان کے رِدعمل سے ہوتا ہے۔ ان کی سب سے پہلی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کریں جس سے کچھ نہ کچھ حاصل ہو۔ یہ معلوم ہونے کے بعد ہی کہ ان کے وقت اور محنت کی کوئی قدر ہے، وہ اُن کی قدر میں مزید اضافے کے خواہش مند ہوں گے۔ ایسی صورت میں پیداوار ہمیشہ کم نہیں رہے گی کیوں کہ یہ ایک ایسی حرکی کی صورت ہے جو ترقی کو فروغ دیتی رہے گی۔

بے روزگار آدمی مایوسی کی حالت می ہجرت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ کام حاصل کرنے کے مواقع ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہیں اس لیے اس معاشی منصوبہ بندی میں بھی اولیت ملنی چاہیے۔

ماہیت کار:

اب کرنے کا کام یہ ہے کہ دیہی علاقوں اور چھوٹے قصبات میں لاکھوں کی تعداد میں کار گاہیں بنائی جائیں۔ جدید صنعت، جسے ترقی یافتہ ممالک میں فروغ حاصل ہوا ہے، اس سے اس کام کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ ان معاشروں میں پنپتی ہے جہاں سرمایہ کثیر اور کارکن کم ہیں لہٰذا ایسے ملکوں کے لیے، جہاں کارکن زیادہ اور سرمایہ کم ہو، یہ بالکل مناسب نہیں_____ بھارت اور ترکی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ یہاں بڑے بڑے پنج سالہ منصوبوں کی کارگزاریوں کا حاصل یہ ہوتا رہا ہے کہ ان کے آغاز کے مقابلے میں خاتمے پر بے روزگاری میں مزید اضافہ ہوتا رہا ہے۔

ہم اب اپنے طریق کار کے لیے چار مفروضے بناتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ کارگاہیں ایسی جگہوں پر بنانی ہوں گی جہاں لوگ رہتے ہوں، ان شہروں میں نہیں جہاں وہ ہجرت کر جانا چاہتے ہوں۔

۲۔ کارگاہیں ارزاں قسم کی ہونی چاہییں تاکہ وہ بڑی تعداد میں قائم ہوسکیں اور ان پر سرمایہ کاری اور درآمدی اشیا کا بوجھ نہ ہو۔

۳۔ پیداواری طریق کار بھی سادا ہونا چاہیے تاکہ اعلیٰ ہنرمندی کا تقاضا کم سے کم ہو۔ طریق پیداوار ہی نہیں یہ سادگی تنظیم، خام مواد کی فراہمی، سرمایہ لگانے، اشیا کی فروخت وغیرہ ہر شعبے میں کام میں لائی جانی چاہیے۔

MashalBooks.com

۴۔ پیداوار محض مقامی خام مال کے ذریعے ہو اور محض مقامی ضرورتوں کے لیے ہو۔

یہ چاروں تقاضے صرف اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب ترقیاتی منصوبہ محض علاقائی سطح کا ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ ترقیاتی کام کے لیے شعوری کوشش ''اوسط ٹیکنالوجی'' کے تصور کے مطابق ہو۔

علاقائی یا ضلعی سطح کی ترقی کا مفہوم

ترقیاتی منصوبہ بندی کے ذریعے ایسے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے، جنہیں اس کی اشد ضرورت ہو، پورے وسیع سیاسی منطقے کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہیے۔ بعض صورتوں میں یہ منطقہ چھوٹا ہو سکتا ہے لیکن بالعموم وسیع و عریض ہوتا ہے۔ بھارت کو مثال کے طور پر لے لیجیے۔ سیاسی طور پر ہی ایک وسیع ملک ہے اور مختلف نقطہ ہائے نظر سے اس کی سیاسی وحدت برقرار رہنی چاہیے لیکن اگر معاشی منصوبہ بندی کے لیے پورے ملک کو پیش نظر رکھا جائے تو فطری طور پر ترقیاتی کام جدید صنعتی حوالوں سے محض چند بڑے بڑے شہروں تک محدود رہیں گے۔ وہ وسیع علاقے، جن میں ملک کی اسّی فیصد آبادی رہتی ہے، کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے۔ اس طرح بے روزگاری اور شہروں کی جانب دوڑ کی رفتار بڑھتی جائے گی۔ ترقیاتی کاموں کا نتیجہ تھوڑے سے خوش قسمت لوگوں کی دولت اور کثیر آبادی کی غربت میں اضافہ ہوگا۔ اگر ترقیاتی کاموں کا مقصد اُن کی امداد ہے جو اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں تو ملک کے ہر علاقے اور ہر ضلع میں یہ کام ہونا چاہیے۔ علاقائی سطح پر ترقی کا یہی مفہوم ہے۔

دوسری مثال اطالیہ کی ہے جو نسبتاً خوشحال ملک ہے۔ اطالوی صنعتیں شمال میں مرکوز ہیں۔ سسلی اور جنوبی اطالیہ کے علاقے ترقی سے محروم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جنوب سے تمام ذہین اور کارگزار لوگ شمال کی طرف مراجعت کر جاتے ہیں۔ ان کو رجحانات کو روکنے کے لیے شعوری کوششیں درکار ہیں۔ اگر کسی ملک کے کسی حصے کی آبادی ترقی میں پیچھے رہ جائے تو اس کی حالت پہلے سے بدتر ہو جاتی ہے۔ بے روزگاری بڑھ جاتی ہے اور ترقی یافتہ شہروں کی طرف دوڑ لگ جاتی ہے۔ اس کی مثالیں دنیا بھر کے ترقی یافتہ ملکوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

سوئٹزرلینڈ کی آبادی کم و بیش ساٹھ لاکھ ہے لیکن یہ بیس ضلعوں میں تقسیم ہے۔ ہر ضلع بطور خود ترقی یافتہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آبادی اور صنعتیں پھیلی ہوئی ہیں اور کسی خاص مقام پر ان کا

اجتماع وارتکاز نہیں ہے۔

ضلع کا تصور یہ ہونا چاہیے کہ اس میں ایک طرح کی وحدت و یگانگت ہو اور اس میں کم از کم ایک قصبہ ایسا ہو جو ضلعی مرکز بن سکے۔ معاشی ڈھانچے کے ساتھ ساتھ تہذیبی ڈھانچہ بھی استوار ہونا چاہیے۔ اگر ہر گاؤں میں ایک پرائمری سکول ہو تو چند چھوٹے قصبات میں بازار کے ساتھ سیکنڈری سکول ہوں۔ یوں ضلعی مرکز کو اتنا بڑا ہونا چاہیے کہ اس میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہو۔ لہٰذا جتنا بڑا ملک ہو اُتنی ہی اس بات کی ضرورت ہے کہ اس میں کثرت سے اندرونی ''ڈھانچے'' ہوں اور ترقیاتی منصوبہ بندی میں لامرکزیت ہو۔

مناسب ٹکنالوجی کی ضرورت:

علاقائی منصوبہ بندی میں مناسب ٹکنالوجی کا استعمال لازمی ہے۔ جدید صنعتوں کی تنصیب کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت ہے۔ غریب ممالک کسی خاص مدت میں بہت کم جدید صنعتیں نصب کر سکتے ہیں علاوہ ازیں جدید صنعتوں کی پیداواری صلاحیت محض جدید ماحول میں بروئے کار آسکتی ہے۔ کسی ضلعے کے چھوٹے موٹے قصبات اور دیہاتی ماحول میں اس کا کام کرنا، ممکن ہے۔ ہر ترقی پذیر ملک کے دیہی علاقوں میں ایسے کئی صنعتی ادارے مل جائیں گے جو بسا اوقات بند رہتے ہیں کہ وہاں ادارتی تنظیم، سرمایہ، خام مواد کی یافت، ٹرانسپورٹ، بازاری سہولتیں اور دیگر ضرورتیں میسر نہیں آتیں۔ شکایتیں تو بہت سی ہوتی ہیں لیکن اسے تسلیم نہیں کیا جاتا کہ بہت سا سرمایہ، جو جدید میشنوں کی درآمد پر خرچ ہوا، برباد ہو چکا ہے۔

کسی علاقے کے لیے صنعت کا انتخاب ایک چیز ہے اور اس صنعت کے فروغ کے لیے کس قسم کی ٹکنالوجی حاصلکی جائے یہ اور بات ہے۔ کوئی صنعت کسی علاقے کے لیے مناسب ہے یا نہیں، اس کا انحصار اس بات پر نہیں کہ وہ کس پیمانے کی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس میں کس قسم کی ٹکنالوجی کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ افلاس زدہ علاقوں میں اقتصادی ترقی صرف اسی وقت فائدہ مند ہوگی جب اس میں ''اوسط ٹکنالوجی'' کا استعمال ہوگا۔ یہ ٹکنالوجی سرمائے کے بجائے کارکنوں پر توجہ دے گی اور چھوٹے پیمانے کے اداروں کے تحت کام کرے گی۔

اوسط ٹکنالوجی کی تعریف:

کسی کارخانے میں استعمال ہونے والے آلات واوزار کے حوالے سے اگر ٹکنالوجی کی

تعریف کریں تو کسی غیر ترقی یافتہ ملک کی دیسی ٹکنالوجی کو علامتی طور پر ''ایک روپے والی ٹکنالوجی'' کہہ سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف ترقی یافتہ ملک کی جدید ٹکنالوجی ''ایک ہزار روپے والی ٹکنالوجی'' ہوگی۔ ان دونوں میں اتنا بڑا فرق ہے کہ ایک سے دوسری کی طرف مراجعت تقریباً ناممکن ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی یہ کوشش کہ پانی معیشت میں جدید ٹکنالوجی کو داخل کریں دیسی صنعت کے لیے مہلک ہے۔ دیسی صنعتوں کی تباہی کی رفتار تو بہت تیز ہوتی ہے جب کہ جدید صنعتیں اتنی تیزی سے نصب نہیں ہوسکتیں۔ غریب عوام پہلے سے زیادہ تباہ حال ہو جاتے ہیں۔ واقعی ان کی مدد مقصود ہو تو ایسی صنعت کی ضرورت ہوگی جو ان دونوں کے درمیان میں ہو، جسے ہم علامتی طور پر ''ایک سو روپے والی ٹکنالوجی'' کہیں گے۔

''اوسط ٹکنالوجی'' دیسی ٹکنالوجی کے مقابیل میں زیادہ پیداوار دے گی اور جدید ٹکنالوجی کے مقابلے میں بہت زیادہ سستی ہوگی۔ کارخانوں کی تعداد بھی بہت کم وقت میں بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ علاوہ ازیں ضلعے کے زیادہ مستعد اور ذہین لوگوں کے لیے اس کا حصول آسان ہوگا۔ نسباً کم ترقی یافتہ ماحول میں۔ جہاں اسے استعمال ہونا ہو یہ بڑی آسانی سے کھپ جائے گی۔ آلات اور قابل فہم ہوں گے جنہیں موقع پر ہی درست کیا جاسکے گا۔ کارکنوں کو بہ آسانی تربت دی جاسکنے گی، نگرانی، نظام وضبط اور ادارتی تنظیم میں سادگی ہوگی اور آئندہ کی انجانی مشکلات کا سامنا کم سے کم ہوگا۔

اعتراضات کی نوعیت اور ان پر بحث:

''اوسط ٹکنالوجی کے تصور پر سب سے اعتراض یہ ہوا کہ'' آپ بہترین کو روک کر یہ چاہتے ہیں کہ ہم کم تر اور فرسودہ کے ساتھ گزارکریں۔'' یہ ایسے لوگوں کی آواز ہے جو ضرورت مند نہیں ہیں۔ اپنی مدد آپ کر سکتے ہیں اور فوری طور پر اعلیٰ تر معیارِ زندگی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اُن افلاس زدہ عوام کی آواز نہیںہے جن کے پاس زندگی کی کوئی مستحکم بنیاد ہی نہیں ہے خواہ وہ دیہاتوں کے باسی ہوں یا شہروں کے رہنے والے۔ ڈاکٹر کال ڈور کا دعویٰ ہے کہ ''تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرمایہ کے یونٹ کے اعتبار سے جدید ترین مشینوں کی پیداوار کم تر درجے کی مشینوں کے مقابلے میں، جن میں کارکن زیادہ ہوتے ہیں، بہت زیادہ ہوتی ہے۔''

ایسے دلائل کے بارے میں پہلی بات تو یہی کہی جاسکتی ہے کہ یہ جامد کردار کے حاصل

ہوتے ہیں اور ترقیات کی متحرک صورتِ حال کو نہیں سمجھ سکتے۔ انصاف یہ ہے کہ ہمیں مشینوں اور مجرد تصورات کے مقابلے میں انسانی ردِّعمل اور ان کی صلاحیتوں پر زیادہ غور کرنا چاہیے۔

ذرا ڈاکٹر کال ڈور سے یہ پوچھیے کہ کیا کوئی قانون ایسا ہے کہ اگر سرمائے کو کم جگہوں پر مرکوز کر دیا جائے تو سرمایہ/پیداوار کا تناسب بڑھ جائے گا؟ مشینوں کا مصرف ہی یہ ہوتا ہے کہ محنت کی پیداواری قوت کو بڑھایا جائے یعنی کارکن/پیداوار کا تناسب۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں جہاں ٹکنالوجی کی جدت کے باعث پرانے کارخانے بند ہو گئے، سرمایہ زیادہ لگانا پڑا لیکن پیداوار میں اضافہ نہ ہو سکا۔

یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ کم ترقی یافتہ مالک میں ایسے باصلاحیت افراد کی کمی ہوتی ہے جو صنعت سے متعلق انتظامی امور سرانجام دے سکیں لہٰذا صنعتیں وہاں نصب ہونی چاہییں جہاں ان کی کامیابی کی زیادہ توقع ہو مثلاً بڑے شہروں یا ان کے قرب و جوار میں۔ مزید براں ان صنعتوں کے لیے بہترین آلات کار بھی مہیا ہوں۔ یہ دلیل بھی ''صلاحیت کار'' کو ایک مقررہ مقدار تصور کرتی ہے۔ یہ مقررہ اور متعین نہیں ہوتی بلکہ اس ٹکنالوجی کے مطابق ہوتی ہے جسے بروئے کار لانا ہے۔ جو لوگ جدید ترین صنعتوں میں اہلیت کار نہیں جتا سکتے ہے کہ وہ اوسط ٹکنالوجی کے سلسلے میں نہایت باصلاحیت ثابت ہوں۔ میرا خیال ہے صلاحیت کار کی کمی ان منفی اثرات کے باعث ہوتی ہے جو سیدھے سادھے ماحول میں اعلیٰ درجے کی ٹکنالوجی کی مداخلت سے پیدا ہوتے ہیں۔

دو دلائل اور دیے جاتے ہیں۔ اوسط ٹکنالوجی کی پیداوار کو ریاستی تحفظ کی ضرورت ہوگی نیز یہ کہ یہ پیداوار برآمد کے لیے مناسب نہ ہوگی۔ یہ خیال دلائل ہیں۔ ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ مخصوص ضلعی یونٹوں کی مخصوص پیداوار نے ثابت کر دیا ہے کہ اوسط درجے کی ٹکنالوجی کی پیدا کردہ اشیا بمقابلہ ان اشیا کے، جو شہروں کی جدید ترین ٹکنالوجی نے پیدا کی ہیں، زیادہ سستی ہوتی ہیں۔ رہ گئی برآمد کی بات تو یہ بحث طلب ہے۔ بے روزگار اشخاص برآمدات میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ اصل کام تو یہ ہے کہ انہیں روزگار مہیا کیا جائے تاکہ وہ مقامی خام مواد سے مقامی استعمال کے لیے کارآمد چیزیں بنا سکیں۔

اوسط ٹکنالوجی کا استعمال:

اوسط ٹکنالوجی کا استعمال عام نہیں ہے۔ جو آلات بالعموم استعمال کیے جاتے ہیں وہ اعلیٰ

درجے کی ٹکنالوجی کی پیداوار ہیں جنہیں کسی اور طرح بنایا نہیں جاسکتا۔ تاہم ایسے آلات غریب عوام کی فوری ضروریات کو پورا نہیں کرتے۔ غریبوں کی فوری اور شدید ضروریات تو تعمیراتی سامان، لباس، گھریلو ضروریات کے سامان، زراعت سے متعلق آلات و اوزار اور زراعتی پیداوار کی زیادتی ہیں۔ بہت سی جگہوں پر درخت، پانی اور غلہ جمع کرنے کی سہولتیں بھی ان کی فوری ضرورتوں میں شامل ہوتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں اوسط ٹکنالوجی کے اطلاق کے لیے بہترین مواقع فراہم کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں اوسط ٹکنالوجی کے اطلاق کے اور بڑی صورتیں بھی ہیں۔ میں حال ہی شائع شدہ ایک رپورٹ سے دو مثالیں پیش کرتا ہوں:

> پہلی صورت افریقی، ایشیائی اور لاطینی امریکی ملکوں کی حکومتوں کی اس پالیسی میں مضمر ہے جس کے مطابق وہ تیل صاف کرنے کے کارخانے اپنے ملکوں میں لگاتے ہیں خواہ ان کے لیے منڈیاں کتنی ہی کم کیوں نہ ہوں۔ یوں بین الاقوامی فرمیں کم سرمائے والی چھوٹی چھوٹی ریفائزیاں بنا رہی ہیں جن کی قیمتیں بھی کم ہیں اور جو اعلیٰ پیمانے کی ریفائزیوں کی عمدگی کی حامل ہیں۔
>
> دوسری صورت امونیا کی پیداوار کے لیے کم قیمت پلانٹوں کی ہے جو چھوٹی منڈیوں کے لیے سازگار ہے۔

اوسط ٹکنالوجی کے تصور کے یہ معنی نہیں کہ ہم ماضی کے فرسودہ آلات کے استعمال کی طرف لوٹ جائیں۔ اگر غور کیا جائے تو ترقی یافتہ ممالک میں آج سے سو سال پہلے جو طریق پیداوار رائج تھے ان سے آج بھی خاطر خواہ نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ بسا اوقات بے جا طور پر یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ مغربی سائنسی علوم کا حاصل وہ آلات اور مشینیں ہیں جو ان کی مدد سے تیار ہوئی ہیں لہٰذا اگر انہی مسترد کر دیا جائے تو یہ بات سائنسی علوم کو مسترد کرنے کے مترادف ہوگی۔ یہ انتہائی سطحی بات ہے۔ اصل چیز تو علم ہے جس کا اطلاق مختلف صورتوں میں کیا جاسکتا ہے۔ جدید صنعت تو اس کی محض ایک صورت ہے لہٰذا اوسط ٹکنالوجی کا حصول تو آگے کی طرف ایک قدم ہوگا جس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ملازمتوں کو ختم کرنے والے اور محنت بچانے والے قیمتی اور پیچیدہ ذرائع پیداوار کے بجائے ایسی ٹکنالوجی چاہتے ہیں جو ایسے معاشروں کے تقاضوں کو پورا کرے جن میں کارکنوں اور مزدوروں کی بہتات ہوتی ہے۔

اوسط ٹکنالوجی کا استعمال اگرچہ عام نہیں ہے پھر بھی ہر ترقی پذیر ملک میں، نیز ترقی یافتہ

ملکوں میں بھی اس کی خاصی زیادہ مثالیں ملتی ہیں۔ کمی محض اس بات کی ہے کہ ایسی ٹکنالوجی استعمال کرنے والے ایک دوسرے سے کماحقہ واقف نہیں ہیں، ایک دوسرے کی تائید نہیں کرتے اور ایسے لوگوں کی مدد کرنے سے قاصر ہیں جو اسی راستے پر چلنا چاہتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ سفر کیسے شروع کریں۔ فی زمانہ تو یورپی اور امریکی برآمد کنندگان کی پیش کردہ مشینوں کی فہرست ہی ٹکنیکی امداد کا ماخذ سمجھی جاتی ہے۔ سرکاری طور پر بھی بڑے پیمانے کے منصوبوں کے لیے جدید ترین ٹکنالوجی کو ہی پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ہم بڑے منصوبوں کے ساتھ سرکاری دلچسپی کو ختم کرا سکیں اور انہیں غریب لوگوں کی ضروریات کا احساس دلا سکیں تو یہ جنگ بڑی حد تک جیتی جاسکتی ہے۔ جدید اوسط ٹکنالوجی کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے اس وقت بھی ایسا علم و تجربہ وافر مقدار میں موجود ہے جو ہر شخص کو کام پر مایل کرسکتا ہے۔ البتہ اگر کہیں خلا موجود ہوں تو انہیں پُر کرنے کے لیے آلات کے نئے ڈیزائن اور ساخت کا مطالعہ فوری طور پر کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر گیڈگل نے پونا کے سیاسی و معاشی انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر کی حیثیت نے اوسط ٹکنالوجی کی ترقی کے متعلق تین طریقوں کی نشاندہی کی ہے:

> پہلا طریق تو یہ ہے کہ روایتی صنعتوں کے پرانے طریقوں سے ابتداء کی جائے اور زیادہ ترقی یافتہ طریقوں کو علم کو انہی مناسب طور پر بہتر بنانے کے لیے استعمال کیا جائے۔
>
> دوسرا طریقہ یہ ہوگا کہ جدید ترین ترقی یافتہ ٹکنالوجی سے شروعات کی جائے اور اس میں اوسط ٹکنالوجی کے تقاضوں کے مطابق ترمیم کی جائے۔ بعض صورتوں میں یہ ترمیم مخصوص مقامی حالات کے مطابق ہوگی مثلاً موجود ایندھن یا توانائی کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔
>
> تیسرا طریقہ یہ ہوگا کہ اوسط ٹکنالوجی کو براہِ راست حاصل کرنے کے لیے تحقیقات و تجربات عمل میں لائے جائیں۔ یہ طریق کار صرف اس وقت کارآمد ہوگا جب ہم سائنس دانوں اور انجینئروں کو محدود معاشی صورت حال سے پوری طرح آگاہ کردیں۔ اوسط ٹکنالوجی کے حصول کی یہ کوشش بلاشبہہ ترقی یافتہ ٹکنالوجی کے پس منظر میں ہی ہوگی۔ بہرصورت اس کوشش میں ترمیم اور اضافے کی کوششوں کے مقابلے میں زیادہ امکانات مضمر ہیں۔

MashalBooks.com

اس صورتِ ال کو اختصار کے ساتھ ہم یوں بیان کریں گے:

۱۔ ترقی پذیر ممالک میں دوغلی معیشت ابھی ایک مدت تک قائم رہے گی۔ جدید معیشت سارے ملک کو خود میں جذب نہیں کر سکتی۔

۲۔ غیر ترقی یافتہ علاقوں کو ترقی دینے کی خصوصی کوششیں نہ کی گئیں تو عام بے روزگاری اور شہروں کی طرف بھاگنے کا عمل جاری رہے گا اور اس طرح ترقی یافتہ علاقوں میں بدحالی پھیلے گی۔

۳۔ غریب عوام کو اس طرح کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی مدد آپ کر سکیں مگر شرط یہ ہے کہ انہیں ایسی ٹکنالوجی مہیا کی جائے جو غربت کے معاشی حدود کا خیال رکھے یعنی اوسط ٹکنالوجی۔

۴۔ ایسے قومی اور بین الوقامی پروگراموں کی ضرورت ہے جو ایسی ٹکنالوجی مہیا کر سکیں جو ترقی پذیر ممالک ہیں ہر شخص کو روزگار کی ضمانت دے۔

بیس لاکھ گاؤں

جب ہم ترقیاتی کاموں کی بات کرتے ہیں تو ہمارے پیش نظر بنیادی طور پر کیا ہوتا ہے؟ ساز و سامان یا انسان؟ اگر انسان تو پھر کون سے انسان؟ وہ کون لوگ ہیں؟ کہاں ہیں؟ امداد کیوں چاہتے ہیں؟ اور اگر امداد کے بغیر چارہ نہیں تو پھر کس قسم کی مدد انہیں درکار ہے؟ یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوال اس وقت ہمارے ذہن میں اُبھرتے ہیں جب ہم انسانی تعلقات کے حوالے سے سوچتے ہیں۔ لیکن سامان کے حوالے سے اتنے سوالات پیدا نہیں ہوتے بالخصوص اس وقت جب ماہرین اقتصادیات و شماریات اُن حوالے سے سوچیں۔ اُن کے نزدیک تو سامان بھی کوئی تشخص قائم نہیں رکھتا۔ وہ ''مجموعی قومی پیداوار''، ''برآمد''، ''بچت''، ''لاگت'' اور اس قسم کی دوسری چیزیں بن جاتا ہے۔ اس قسم کی مجردات کے استعمال میں اصل لوگوں کی شکل نظر نہیں آتی۔ کہیں کہیں ''آبادی'' کا لفظ بے شک نظر آئے گا مگر وہ بھی محض مقدار کے طور پر یہ ظاہر کرنے کے لیے یہ سامان کو آبادی میں تقسیم ہونا ہے۔

لوگوں کے ساتھ برتاؤ کے مقابلے میں سامان کو برتنا زیادہ آسان ہے۔ شاید اس لیے کہ سامان کا کوئی اپنا ذہن نہیں ہوتا، اسی لیے وہاں ابلاغ کا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔ اور اگر زور انسانوں پر ہو تو ابلاغ کا مسئلہ اہم ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مدد دینے والے اور مدد حاصل

کرنے والے کون لوگ ہیں؟ مدد دینے والا تو بالعموم امیر اور ایک خاص مفہوم میں تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، نیز یہ کہ وہ شہروں کے باسی ہوتے ہیں جنہیں مدد کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے غریب، غیر تعلیم یافتہ اور دیہاتی ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان دونوں کے درمیان تین وسیع و عریض خلیجیں حایل ہوتی ہیں۔ ایک خلیج تو امیر اور غریب کی ___ دوسری تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ کی ___ تیسری شہری اور دیہاتی کی جس میں صنعت اور زراعت کا فرق بھی شامل ہے۔ ترقیاتی امداد کا سب سے پہلا مسئلہ تو یہی ہوگا کہ ان خلیجوں کو کیسے پر کیا جائے؟ اس کے لیے تخیل، مطالعے، اور ہمدردی کی بہت زیادہ ضرورت ہوگی۔ پیداوار کے طریق کار، صرف کے مونے، اور اقدار و تصورات کے ایسے نظام، جو شہر کے نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور دولت مند لوگوں کی زندگی سے مناسبت رکھتے ہیں، غریب کسانوں اور غیر تعلیم یافتہ دیہاتیوں کے مناسب حال نہیں ہوں گے۔ غریب کسان یک بیک مہذب شہریوں کے زاویہ ہائے نظر اور عادات واطوار کو اپنا نہیں سکتے لہٰذا اگر لوگ طریقِ کار سے مطابقت نہیں رکھتے تو طریق کار لوگوں کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ یہی سارے معاملے کی جڑ ہے۔

علاوازیں امیروں کی معیشت کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جو بطور خود محل نظر ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ غریبوں کے لیے مناسب نہیں بلکہ یہ بھی کہ اگر لوگوں کو ان کے مطابق ڈھالا جائے گا تو وہ بربادی کا پیش خیمہ ہوں۔ اگر تبدیلی اس طرح کی ہو کہ باپ کے پاس بیٹوں کو بتانے کے لیے کچھ نہ ہو یا بیٹے باپ سے کچھ نہ لے سکیں تو خاندانی زندگی تباہی لازمی ہوگی۔ زندگی، محنت اور معاشروں کی خوشحالی کا دارومدار بعض ''نفسیاتی ڈھانچوں'' پر ہوتا ہے جو حد درجہ قابل قدر بھی ہوتے ہیں اور قابل شکست بھی۔ معاشرتی اتحاد، امداد باہمی، باہمی احترام اور سب سے بڑھ کر عزت نفس، مصیبت کا ہمت سے مقابلہ اور تکلیفوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت یہ باتیں اور ان کے علاوہ اور بہت کچھ اس وقت شکست وریخت کا شکار ہو جاتا ہے جب یہ ''نفسیاتی ڈھانچے'' مجروح ہونے لگتے ہیں۔ یہ یقین، کہ وہ بے مصرف ہے، آدمی کو برباد کر دیتا ہے۔ معاشی ترقی ان نقصانات کی تلافی نہیں کر سکتی۔

میری نظر میں دنیا بھر کی غربت کا اصل مسئلہ بیس لاکھ دیہاتوں کا ہے یا دنیا بھر کے کروڑوں دیہاتوں کا، ان کا حل غریب ممالک کے شہروں میں نہیں مل سکتا۔ جب تک دور افتادہ دیہاتوں کی زندگی کو قابل برداشت نہیں بنایا جاتا اس وقت تک دنیا کی غربت کا مسئلہ حل نہیں

ہوسکتا اور رفتہ رفتہ زیادہ تشویش ناک ہوتا جائے گا۔

''مجموعی قومی پیداوار''، ''سرمایہ کاری''، ''بچت''۔اس قسم کی مجرد اصطلاحوں کا استعمال اس مقداری طرز فکر کا پتا دیتا ہے جس میں بصیرت کا فقدان نظر آتا ہے۔ترقی یافتہ ممالک کے سلسلے میں تو یہ برمحل ہیں لیکن ترقیاتی مسائل کے سلسلے میں یہ بالکل بے معنی ہیں۔(امیر ممالک کی ترقی میں بھی ان کا کوئی مصرف نہیں رہا ہے)۔ترقی پذیر ممالک کو دی جانے والی امداد محض اس وقت کارآمد ہوسکتی ہے جب وہ عوام کی محنت کو بروئے کار لائے اور محنت کو ''بچائے'' بغیر پیداوار کی سطح بلند کرے۔کامیابی کا وہ عام معیار جسے ''مجموعی قومی پیداوار'' کی ترقی کا نام دیا جاتا ہے گمراہ کن ہے۔وہ بالآخر اس فضا کو پیدا کرنے میں معاون ہوگا جسے محض ''نئی سامراجیت'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔

میں یہ اصطلاح استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ایک تو یہ لفظ ہی مکروہ ہے، دوسرے اس میں یہ مفہوم مضمر ہے کہ امداد دینے والے ممالک کے ارادے نیک نہیں ہوتے۔کیا امداد میں کوئی بدنیتی شامل ہوتی ہے؟ مجموعی طور پر میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوتا لیکن اس سے مسئلہ اور شدید ہو جاتا ہے۔غیر ارادی سامراجیت زیادہ گہری اور خفیہ ہوتی ہے اور اس کا مقابلہ زیادہ مشکل ہوتا ہے بہ نسبت اس سامراجیت کے جسے بالارادہ فروغ دیا جائے۔یہ بہترین ارادوں کے باوجود اشیا کے بے جا ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔پیداوار کے طریق کار، صرف کے معیارات، کامیابی اور ناکامی کے پیمانے، نظام اقدار، برتاؤ کے سلیقے۔وہ تمام باتیں جو خوشحالی کی صورتِ حال سے مطابقت رکھتی ہیں جب غریب ممالک میں داخل کی جاتی ہیں تو وہ انہیں دولت مند ممالک کے رحم وکرم پر ڈال دیتی ہیں۔سامنے کی واضح مثال قرضوں میں مسلسل اضافہ ہے۔نیک نیت لوگوں کا اس ضمن میں خیال یہ ہے کہ عطیات قرضوں سے بہتر ہوتے ہیں اور سستے قسم کے قرضے مہنگے قرضوں سے بہتر ہوتے ہیں۔بالکل صحیح۔تاہم قرضوں میں اضافہ کوئی زیادہ تشویش ناک بات نہیں۔قرض دار جب قرض واپس نہیں کر سکے گا تو ادائیگی بند کردے گا۔یہ خدشہ تو قرض دینے والے کے ذہن میں پہلے ہی سے ہوتا ہے۔

تشویش ناک بات تو وہ محکومی ہے جو کسی غریب ملک کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب وہ دولت مند ممالک کے پیداواری طریقے اور صرف کے معیارات کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔افریقہ کی ایک ٹکسٹائل مِل اس بات کا بین ثبوت ہے۔مل کے منیجر نے بڑے فخر سے مجھے بتایا

کہ اس کا کارخانہ ایسی اعلیٰ ٹکنالوجی کا حامل ہے جس سے بہتر دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔ یہ اتنی زیادہ خودکار کیوں ہے؟ اُس کا جواب یہ تھا کہ افریقی محنت کش صنعتی کاموں کا کوئی تجربہ نہیں رکھتا لہٰذا غلطیاں کرسکتا ہے مگر خودکار مشین غلطیاں نہیں کرے گی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ چونکہ دنیا میں اعلیٰ ترین معیارات کی طلب ہے اس لیے کوئی منڈی حاصل کرنے کے لیے میرے سامان کو بھی نہایت اعلیٰ درجے کا حامل ہونا چاہیے۔ اس نے اپنے حسن کارکردگی کے اظہار کے طور پر یہ کہا کہ میرا کام یہ ہے کہ میں انسانی عنصر کو پیداواری عمل سے خارج کردوں۔ محض یہی نہیں، اعلیٰ معیاری تلاش میں اسے تمام ساز وسامان اعلیٰ ترین ترقی یافتہ ممالک سے درآمد کرنے پڑے۔ ایسے ساز وسامان کا تقاضا یہ تھا کہ انہیں برتنے کے لیے تمام اہلکار بھی باہر سے درآمد کیے جائیں۔ خام مواد کی درآمد بھی لازمی ٹھہری کیوں کہ مقامی روئی سے اعلیٰ معیار کا دھاگا نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ یہ تو محض ایک مثال ہے۔ مختلف اشیا کی پیداوار میں ایسا ہی طریق کار برتا جاتا ہے۔ معیاری خام مواد باہر سے زیادہ قیمتوں پر درآمد کیا جاتا ہے جب کہ مقامی خام مواد کم قیمت پر برآمد کیا جاتا ہے۔ اس طرح غریب ممالک ایسے طریق پیداوار وصرف کی پھسل پڑتے ہیں یا انہیں دھکیلا جاتا ہے جو خود کفالت اور اپنی مدد آپ کے تمام امکانات کی نفی کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ غیر ارادی سامراجیت اور غریبوں کی انتہائی بدحالی ہے۔

بہترین امداد عقل ودانش کی امداد ہے۔ افادی علم کا تحفہ ___ علم کا تحفہ مادی اشیا کے تحفے سے حددرجہ زیادہ کارآمد ہوتا ہے۔ کوئی بھی چیز ''ہماری اپنی'' اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک کہ اس کے لیے کوئی سچی کاوش نہ ہو یا قربانی نہ دی جائے۔ مادی اشیا کا تحفہ تو لینے والا بلا کسی کوشش یا قربانی کے ہتھیا لیتا ہے لہٰذا یہ ''اُس کی اپنی'' نہیں بن پاتیں اور بسا اوقات اُنہیں آندھی کے پھل ہی تصور کیا جاتا ہے۔ علم ودانش کا عطیہ مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے حصول کے لیے محنت، کوشش، کاوش اور قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مادی اشیا کا تحفہ لوگوں کو محکوم بناتا ہے علم کا تحفہ اُنہیں آزاد کرتا ہے بشرطیکہ علم صحیح نوعیت کا ہو، اس کے اثرات دوررس اور ''ترقی'' کے تصور سے گہری مناسبت رکھتے ہوں۔ کسی شخص کو آپ ایک مچھلی دے دیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کی ضرورت پوری ہوجائے گی۔ اُسے مچھلی پکڑنے کا فن سکھا دیں تو وہ ساری زندگی اپنی ضرورت پوری کرتا رہے گا۔ آگے چلیے۔ آپ اُسے مچھلی کا کانٹا دے دیں۔ آپ کا پیسہ بھی خرچ ہوگا اور نتائج بھی مشکوک رہیں گے۔ تاہم فرض کیجیے کہ نتائج صحیح نکلے پھر بھی وہ ساری عمر کانٹوں کی

فراہمی کے لیے آپ ہی پر انحصار کرے گا۔ اب اگر آپ اسے کانٹا بنانے کا فن سکھا دیں تو وہ آپ کی مدد سے نہ صرف یہ کہ خود کفیل ہو جائے گا بلکہ اس کی خود اعتمادی اور آزادی بھی بڑھ جائے گی۔

امدادی پروگراموں کی غایت یہی ہونی چاہیے کہ انہیں متعلقہ علم کا وہ تحفہ دیا جائے جو انہیں خود اعتمادی اور آزادی عطا کرے اور اپنی مدد آپ کے طریقے سکھائے۔ اس امداد کی ایک خوبی یہ ہوگی کہ یہ مقابلتاً کم قیمت ہوگی امداد فنڈ کے محض ایک فیصد کو اگر ''عطیہ علوم'' کی مد میں لگا دیا جائے تو ''ترقیاتی کاموں'' کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جائے گا۔

اگر ایک بار ہم یہ تسلیم کر لیں کہ امداد کا اصل مدعا مناسب علم، تجربے اور طریق کار کی تعلیم دینا ہے یعنی مادی ساز و سامان کی امداد کے بجائے علم و دانش مہیا کرنا ہے تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ امداد کی موجودہ روش بالکل غیر مناسب ہے۔ جب تک ہم یہ سمجھتے رہیں گے کہ ہماری بنایدی کام قرض خواہ ملک کے منصوبوں اور ان کی ضروریات کے لیے رقم مہیا کرنا ہے اس وقت تک ہمارے لیے یہ خیال کرنا فطری امر ہوگا کہ اس ملک کے پاس علم اور تجربہ پہلے سے موجود ہے۔ میں کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ بات، کہ وہاں علم و تجربہ پہلے سے موجود ہے، فرض نہیں کر لینی چاہیے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ کسی قسم کا علم دیا ہی نہیں جا رہا ہے۔ طریق کار یقیناً سکھایا جا رہا ہے لیکن اس کی بنیادی اس مروضے پر رکھی جاتی ہے کہ جو کچھ امیر ممالک کے لیے بہتر ہے وہی غریب ملکوں کے لیے بھی بہتر ہے۔

اب ہم بیس لاکھ دیہاتوں کی طرف آتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم ان کے مناسب حال علم کو ان تک کیسے پہنچا سکتے ہیں۔ اس کام کے لیے کہ انہیں کیا چاہیے، اس کام کے لیے کہ انہیں کیا چاہیے، ہمیں ان کی ضرورتوں کا علم پہلے سے ہونا چاہیے۔ امداد کی بات شروع کرنے سے پہلے خود ہمارے پاس دینے کے لیے کچھ ہونا چاہیے۔ امداد دینے والے ملکوں میں تو ہزاروں غریب دیہات نہیں ہوتے اس لیے ہم ان حالات میں مؤثر طور پر ''اپنی مدد آپ'' کے طریقوں کے بارے میں کیا جان سکتے ہیں۔ عقلمندی کی ابتدا ہی یہیں سے ہوتی ہے کہ ہم پہلے اپنی کم علمی کا اعتراف کر لیں بصورت دیگر ہم غریبوں کے پاس جاتے رہیں گے اور انہیں یہ بتاتے رہیں گے کہ تم یہ اعلیٰ درجے کے کارنامے سرانجام دیے سکتے ہو بشرطیکہ تم امیر ہو جاؤ۔ اب تک ساری امداد کی ناکامی اسی بات میں مضمر رہی ہے۔

تاہم یہ ہمیں معلوم ہے کہ علم اور تجربے کو کیسے منظم کیا جائے۔ ہمیں تقریباً ہر کام سرانجام

دینے کے لیے سہولتیں حاصل ہیں بشرطیکہ ہم یہ جانتے ہوں کہ کون سا کام سرانجام دینا ہے۔ مثلاً اگر ہمیں کم قیمت مکانات کی تعمیر کے طریق کار اور مواد کے بارے میں ایسی معلومات اکٹھی کرنی ہوں جن کی مدد سے ترقی پذیر ممالک کے مقامی عمارت سازوں کی تربیت مقصود ہوتا کہ انہیں مناسب ٹکنالوجی اور طریق کار سمجھائے جاسکیں تو ہم یہ کام بخوبی اور بہت کم مدت میں کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ بہت سے ترقی پذیر ممالک کا بڑا مسئلہ پانی کی فراہمی ہے اور اگر دیہاتیوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ وہ کس طرح اپنی مدد آپ کی بنیاد پر سستے طریقے سے پانی کی فراہمی، سے ذخیرہ کرنے اور اس کے نقل وحمل کے انتظامات کر سکتے ہیں تو یہ ان کی بہت بڑی مدد گوی۔ بلاشبہ ہم اُنہیں ایسی معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔

غریب لوگوں کی ضروریات بہت معمولی اور ان کی زندگی کے بنیادی تقاضوں کے مطابق ہوتی ہیں۔ ان کی مدد بھی انہی سے متعلق ہونی چاہیے۔ اگر، ان میں خود اعتمادی اور اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا نہ ہوا تو ان کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہوگا۔ لیکن ان کے طریقے فرسودہ، ناکارہ اور غیر مؤثر ہیں۔ اُنہی کو نئے علم کی روشنی میں ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ ان کے لیے تو یہ علم نیا ہوگا لیکن ہر ایک کے لیے نیا نہ ہوگا۔ یہ فرض کر لینا کہ غریب لوگ تبدیل نہیں چاہتے، لغو بات ہے۔ تاہم وہ تبدیلی جو ہم لانا چاہتے ہیں اُسے ان کی روزمرہ زندگی کی کارگزاریوں کے ساتھ نامیاتی طور پر متعلق ہونا چاہیے۔ ایسی بے بنیاد انقلابی تبدیلیوں کے بارے میں اُن کے شکوک اور ان کی مخالفتیں بالکل بجا ہیں جو شہری مزاج اور دفتری سوچ رکھنے والے حضرات ان میں لانا چاہتے ہیں۔ اور اُن سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ''تم ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔ ہم تمہیں بتائیں گے کہ تم کتنے ناکارہ ہو اور ہم یہ کام بیرونی رقوم اور بدیسی ساز وسامان کی مدد سے کتنے اعلیٰ پیمانے پر کر سکتے ہیں۔''

غریبوں کی ضروریات نہایت سادہ ہوتی ہیں اس لیے اُن کے مراحل کے بارے میں تحقیق ومطالعے کی ضرورت بھی محدود ہوگی۔ لیکن اس کام کے لیے دوسری قسم کے ادارے کی ضرورت ہوگی۔ (موجود ادارے تو محض ''امداد رقم'' کی ادائیگی کے حوالے سے سوچتے ہیں)۔ فی الواقت تو امداد دینے اور لینے والے ممالک میں ترقیاتی سکیمیں محض سرکاری افسروں کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ لوگ اپنی تربیت اور تجربے کے حوالے سے نہ جدت کے اہل ہوتے ہیں نہ تجدید کے۔ نہ ہی ان کے پاس پیداواری عمل، تجارتی ضروریات اور نقل وحمل کے مسائل کے بارے میں مخصوص تکنیکی

عمل ہوتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک خاص کردار ادا کرتے ہیں جس کے بغیر کسی قسم کی کاروائی ممکن ہی نہیں ہوتی لیکن یہ اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتے۔ان کے ساتھ دوسرے معاشرتی طبقوں کی شمولیت بھی ضروری ہے۔مثلاً کارخانہ داروں، تاجروں اور دیگر پیشہ وروں کی جن میں معلّمین، محققین، اخبار نویس وغیرہ شامل ہیں اور جن کے پاس سوچنے، لکھنے اور بات سمجھانے کا وقت، صلاحیت اور میلان ہوتا ہے۔ان تین گروہوں کے بغیر امداد دینے اور لینے والے ملکوں میں ترقیاتی کام کامیابی سے سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔میں انہیں اے۔بی۔سی۔اشتراک کا نام دیتا ہوں۔اے سے میری مراد ایڈمنسٹریٹر ہیں۔بی سے مراد بزنس مین اور سی سے مراد کمیونیکیشن ہے۔ان تینوں کے اشتراک سے ہی ترقیاتی کام موثر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔

امیر ممالک میں زندگی کے تمام شعبوں میں ایسے اشخاص ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں جو ایسے کاموں میں بخوشی شامل ہو کر دنیا کی غربت کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ ہوں گے۔غریب ملکوں میں بھی ایسے تعلیم یافتہ حضرات موجود ہیں جو امیر ممالک کے فیشنوں کی نقالی پر ہمہ وقت تیار رہتے ہیں (غیر ارادی سامرجیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے) اور اپنے ہم وطنوں کی غربت کے علاوہ دیگر تمام مسائل میں دلچسپی لیتے ہیں۔ایسے لوگوں کو موثر طور پر یہ تحریک دی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے اہم مسائل سے نبرد آزما ہوں۔

مناسب علم اور تجربے کو غریبوں تک پہنچانے کی تحریک تاکہ وہ اپنی مدد آپ کر سکیں، نیز یہ تحریک کہ اے۔بی۔سی۔گروپ کے مددگاروں کو اکٹھا کر کے ترقیاتی کاموں میں مدد دینے پر اکسایا جائے۔ان کاموں کے لیے رقم کی ضرورت تو ہے مگر زیادہ نہیں۔امداد رقوم کا ایک فیصد بھی ایسے کاموں کے لیے ایک مدت تک کافی ہوگا لہٰذا ترقیاتی منصوبوں کے اوپر سے نیچے یا اندر سے باہر تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ضرورت تو صرف سوچ اور طریق کار کی تبدیل کی ہے۔ضرورت یہ کہ تنظیمی ڈھانچے کو نئے سرے سے منظّم کیا جائے کیوں کہ پالیسی پر تو پہلے ہی سے عمل ہو رہا ہے۔

اس نقطۂ نظر کو بروئے کار لانے کے لیے علمی تنظیموں کی ضرورت ہے۔امداد دینے والے ملک میں ہی نہیں بلکہ لینے والے ملک میں بھی اور یہاں اس کی انتہائی ضرورت ہے۔اے۔بی۔سی۔نمونے کی یہ عملی تنظیمیں سرکاری مشینری سے باہر ہونی چاہییں یعنی غیر سرکاری رضا کارانہ تنظیمیں۔ایسی رضا کارانہ تنظیمیں بھی، جو پہلے ہی سے ترقیاتی کاموں میں مشغول ہیں۔ایسے

گروپ بنا سکتی ہیں۔

مذہبی اور غیر مذہبی قسم کی ایسی تنظیمیں بھی ہیں جن میں کارکنوں کی بڑی تعداد نچلے طبقات کی سطح پر کام کرتی ہے۔ وہ بھی اس بات سے آگاہ ہیں کہ ''اوسط ٹکنالوجی'' کا استعمال وہ بہت سی صورتوں میں کرتے رہے ہیں لیکن اس سلسلے میں انہیں منظم طور پر کوئی ٹکنیکی مدد فراہم نہیں کی جاتی۔ بہت سے ملکوں میں کانفرنسیں منعقد ہوئی ہیں، مشترکہ مسائل پر بحثیں بھی کی گئی ہیں۔ تاہم یہ بات ظاہر ہے کہ رضا کار کارکنوں کی قربانیاں بھی اس وقت تک بے کار ہیں جب تک علم، تجربے اور ابلاغ کے لیے منظم کوششیں نہیں کی جاتیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جب تک ''دانشورانہ زیریں ڈھانچہ'' تعمیر نہیں کیا جاتا۔

ایسا زیریں ڈھانچہ تعمیر کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اُنہیں حکومتوں اور رضا کارانہ طور پر عطیات اکٹھا کرنے والی تنظیموں کی مکمل تائید حاصل ہونی چاہیے۔ کم از کم چار مقاصد پورے ہونے چاہییں۔

۱۔ ابلاغ کا مقصد: موقع پر کام کرنے والے تمام کارکنوں کو یہ علم ہونا چاہیے جہاں وہ کام کر رہے ہیں وہاں دوسرے کیا کام ہو رہے ہیں تاکہ آپس میں معلومات کا تبادلہ کیا جا سکے۔

۲۔ معلوماتِ عامہ کا مقصد: ایسی اطلاعات منظم طور پر جمع کی اور پھیلائی جائیں جو ترقی پذیر ممالک کے مناسب حال ٹکنالوجی سے متعلق ہوں، بالخصوص کم قیمت طریقوں سے متعلق جو تعمیرات، پانی اور توانائی، فصلوں کے لیے گوداموں، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں، مراکز صحت اور نقل و حمل وغیرہ کے لیے درکار ہوتے ہیں۔

۳۔ ٹکنیکل مسائل کو حل کرنے کا مقصد: موقع پر کام کرنے والوں کے ٹکنیکی مسائل کو ترقی یافتہ ملکوں میں ایسے مراکز متعارف کرانا جہاں ان کے حل کے لیے مناسب سہولتیں موجود ہوں۔

ان تمام معاملات کے لیے بنیادی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت کچھ پہلے سے موجود ہے۔ ضرورت محض اکٹھا اور منظم کرنے کی ہے۔ صحیح قسم کے علم کی فراہمی میں ہی ترقیاتی امداد کی کارکردگی مضمر ہے۔ یہ ایسا کام ہے جو یقینی طور پر ہو سکتا ہے اور موجود وسائل کی حد میں ہے۔

امیروں کے لیے غریبوں کی مدد کرنا اتنا مشکل کیوں ہے؟ جدید دنیا کی سب سے بڑی

بیماری اس مکمل عدم توازن میں ہے جو شہروں اور دیہی علاقوں میں ہے۔ یہ عدم توازن دولت، قوت، تہذیب، کشش اور توقعات سب پر محیط ہے۔ شہر وسیع تر ہو گئے ہیں اور دیہات سکڑتے جا رہے ہیں۔ شہروں میں مقناطیسی کشش آ گئی ہے اور دیہات اپنی خوشبودار ذائقے سے محروم ہو گئے ہیں۔ تاہم یہ صداقت مسلم ہے کہ جس طرح صحت مند جسم ہی صحت مند ذہن کا ضامن ہے اسی طرح شہروں کی صحت کا انحصار بھی دیہاتوں کی صحت پر ہے۔ اپنی تمام دولت کے باوجود شہر محض ثانوی پیداوار کرتے ہیں جب کہ پیدلوار، جو تمام تر معاشی زندگی کی پہلی شرط ہے، دیہاتوں اور خام مواد پیدا کرنے والوں کے صدیوں کے استحصال کا نتیجہ ہے، آج ساری دنیا کے لیے خطرہ بن گیا ہے۔ غریب ممالک سے بھی زیادہ امیر ممالک کے لیے۔ جدید انسان کے لیے شاید اہم ترین کام شہری اور دیہی زندگی کے درمیان مناسب توازن قائم کرنا ہے۔ مسئلہ محض اتنا ہی نہیں ہے کہ دنیا کی بھوک کو ختم کرنے کے لیے خوراک کی پیداوار بڑھائی جائے۔ عام بے روزگاری اور شہروں کی طرف انبوہی مراجعت کی بیماری کا بھی کوئی علاج نہیں ہے جب تک کہ دیہی زندگی کی پوری سطح کو بلند نہ کیا جائے۔ اس کام کے لیے زرعی مشینی تمدن کو ترقی دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہر ضلع اور ہر برادری اپنے بھائیوں اور ساتھیوں کو رنگ رنگ اور متنوع پیشوں کی پیشکش کر سکے۔

آج کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ مناسب اور مؤثر ترقیاتی کاموں کو عالمی غربت کے مراکز یعنی بیس لاکھ دیہاتوں تک پہنچایا جائے۔ اگر دیہی زندگی شکست وریخت کا شکار ہوتی رہی تو خواہ کتنی ہی رقم خرچ کیوں نہ کی جائے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ترقی پذیر ممالک کے دیہاتوں کو اپنی مدد آپ کرنا سکھا دیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ نتیجہ اصل ترقی ہوگا۔ پھر جھونپڑوں سے پر بڑے بڑے قصبات اور ہر بڑے شہر کے گرداگرد غربت اور مصیبت کی پٹی نہ ہوگی۔ نہ ہی خونی انقلاب کے ظالمانہ آشوب کا خطرہ ہوگا۔ یہ کام یقیناً بہت سخت ہے لیکن وہ وسائل جو تحریک پانے کے انتظار میں ہیں وہ بھی بہت طاقتور ہیں۔

معاشی ترقی وسعت اور گہرائی میں معاشیات سے بہت زیادہ ہے۔ اس کی جڑیں معاشیات کی حدود سے باہر تعلیم، تنظیم اور تربیت میں اور اس سے بھی آگے سیاسی آزادی اور خود اعتمادی کے قومی شعور میں ہوتی ہیں۔ یہ بیرونی ماہرین اور دیسی دانشوروں کے پیوند کاری کے آپریشن سے ''پیدا'' نہیں ہو سکتی۔ دیسی دانشوروں کا تو عوام سے رابطہ ہی ختم ہو چکا ہوتا ہے۔

سائنس دانوں، ٹکنیکل ماہرین اور معاشی منصوبہ سازوں کے ''جادو'' کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ محض ایسے تدریجی عمل کا حاصل ہوسکتی ہے جس میں تمام آبادی کو تعلیم، تنظیم اور تربیت مہیا ہوسکے۔ اس سے کم میں ناکامی ہی ناکامی ہے۔

MashalBooks.com

بھارت میں بے روزگاری کا مسئلہ

(لندن میں بھارتی ترقیاتی گروپ سے بات چیت)

میں جب بے روزگاری کی بات کرتا ہوں تو میری مراد موجود محنت کے بالکل استعمال نہ کرنے یا بہت ہی کم استعمال سے ہوتی ہے۔ ہم پیداوار کے پیمانے کو صفر یعنی کسی شخص کی مکمل بے روزگاری کی پیداوار سے شروع کر کے سو فیصد یعنی کسی ایسے شخص کی پیداوار تک لے جا سکتے ہیں جو مکمل اور موثر طور پر کسی پیشے سے منسلک ہو۔ کسی غریب معاشرت کے لیے سب س اہم سوال یہ ہے کہ اوپری سطح تک کیسے پہنچے۔ کسی معاشرے کی پیداوار کا اندازہ لگانے کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ محض ان کا حساب لگایا جائے جو برسر روزگار ہیں اور انہیں بالکل نظر انداز کر دیا جائے جو بے روزگار ہیں اور جن کی پیداوار صفر ہے۔

معاشی ترقی بنیادی طور پر زیادہ کام لینے کا مسئلہ ہے۔ اس کے لیے چار لازمی شرائط ہیں:

اول یہ کہ تحریک ہو۔ دوم یہ کہ کارکردگی کا کچھ علم ہو سوم یہ کہ کچھ سرمایہ ہو اور چہارم یہ کہ اخراج کا کوئی ذریعہ ہو۔ جتنا زیادہ کام ہوگا اتنی زیادہ منڈیوں کی ضرورت ہوگی۔

جہاں تک کہ تحریک کا تعلق ہے بیرونی طور پر کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر لوگ خود کو بہتر بنانا نہیں چاہتے تو اُنہیں اکیلا چھوڑ دینا چاہیے۔ یہی امداد کا پہلا اصول ہونا چاہیے۔ اندرنا لے مختلف تصور رکھ سکتے ہیں اور ان کی ذمے داریاں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ جہاں تک امداد دینے والوں کا تعلق ہے تو ان کے خیال میں تو ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو خود کو بہتر بنانا چاہتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ کس طرح۔ یہیں سے علم کارکردگی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر لاکھوں انسان خود کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ کس طرح تو پھر انہیں کون بتائے گا؟ ذرا بھارت کے مسئلے کی وسعت پر غور کیجیے۔ چند ہزار یا چند لاکھوں کا مسئلہ نہیں ہے، کروڑوں لوگوں کا مسئلہ ہے۔ یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ تھوڑی بہت مدد، تھوڑی بہت اصلاح، بہتری یا تحریک کے دائرے سے خارج ہے۔ اس طرح یہ بنیادی فلسفہ سیاست کا معاملہ بن جاتا ہے۔ اس معاملے کو ایک سوال میں پیش کیا جا سکتا ہے: تعلیم کس لیے ہوتی ہے؟ میرا خیال ہے کوئی چینی تھا جس نے

جنگ عظیم دوم سے پہلے یہ حساب لگایا تھا کہ ایک شخص کو یونیورسٹی بھیجنا تیس کسانوں کی محنت کے برابر ہوتا ہے۔ اب اگر وہ شخص یونیورسٹی میں پانچ سال لگائے تو یہ کسان کی محنت کے ڈیڑھ سو سال کے برابر ہوگا۔ اس کا کیا جواز ہے؟ اس بات کا کسے حق ہے کہ ایک آدمی کو یونیورسٹی میں پانچ سال رکھنے کے لیے کسان محنت کے ڈیڑھ سو سال ضائع کر دے؟ پھر کسانوں کو بدلے میں ملتا کیا ہے؟ یہ سوالات ہمیں دوراہے پر لے آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا تعلیم ''منافع کا پاسپورٹ'' ہے یا یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے لوگ مقدس عہد یا لوگوں کی خدمت کا مقدس فریضہ سمجھ کر پاتے ہیں؟ پہلی راہ تعلیم یافتہ نوجوان کو بمبئی کے فیشن ایبل علاقے میں لے جاتی ہے جہاں بہت سے دوسرے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ پہلے سے جا چکے ہیں اور جہاں وہ ''استحسانِ باہمی'' کی سوسائٹی کا، منافع بازوں کی ٹریڈ یونین کا ممبر بن کر یہ اطمینان حاصل کر سکتا ہے کہ اس کے ہمعصر عوام، جو تعلیم سے بے بہرہ رہے ہیں، اس کے منافعوں کو چاٹ نہیں سکتے۔ یہ تو ایک راہ ہوئی دوسری راہ پر چلنے والے کی نیت اور ہوگی اور کہیں اور لے جائے گی یہ راہ اُسے واپس عوام کی طرف لے جائے گی جنہوں نے، بہر حال براہ راست، یا بالواسطہ طور پر اس کی تعلیم کا خرچ کسان محنت کے ڈیڑھ سو سال کی صورت میں برداشت کیا ان کی محنت کا پھل کھانے کے بعد اس کی عزت نفس کا یہ تقاضا ہے کہ انہیں کچھ واپس دے۔

یہ مسئلہ نیا نہیں۔ لیوٹالسٹائی نے جب یہ لکھا تھا تو اسی مسئلے کی طرف اشارہ کیا تھا: ''میں ایک آدمی کی پیٹھ پر سوار ہوں۔ اس کے باوجود خود کو اور دوسروں کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ اس کے بارے میں مجھے بہت دکھ ہے، میں اس کی حالت ہر ممکن طریقے سے سدھارنا چاہتا ہوں البتہ خود پیٹھ سے نہیں اتروں گا۔'' میرا خیال ہے کہ آج ہمیں اسی سوال کا سامنا ہے۔ کیا ہم کوئی ایسا نظریہ قائم کر سکتے ہی جو اس بات پر مصر ہو کہ تعلیم یافتہ لوگوں نے اپنے سر ایک ذمہ داری لی ہے، منافع کا پاسپورٹ حاصل نہیں کیا؟ تمام انسانیت کی اعلیٰ تعلیمات اس نظریہ کی تائید کرتی ہیں۔ عیسائی ہونے کی حیثیت سے مجھے سینٹ لوک کا قول دہرانے دیجیے: ''جس کو جتنا زیادہ دیا گیا ہے اس سے اتنے ہی زیادہ کی توقع کی جائے گی۔ اس سے زیادہ پوچھ گچھ ہوگی اس لیے کہ اُسے زیادہ کا امین بنایا گیا ہے۔'' یہی عدل کا بنیادی اصول ہے۔

اگر یہ نظریہ قبولیت حاصل نہیں کر سکتا اور یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ تعلیم مفادات کا پاسپورٹ ہے تو تعلیم کا مواد بھی خدمت عوام کے بجائے اپنی خدمت کے لیے وقف ہو جائے گا۔

یعنی محض تعلیم یافتہ لوگوں کی خدمت ک لیے مفاد پرست اقلیت ایسی تعلیم حاصل کرنا چاہے گی جو اُسے عوام سے علیحدہ رکھے اور بالآخر وہ غلط باتیں سیکھیں گے اور پڑھائیں گے۔ وہ شباتیں جو انہیں علیحدہ رکھیں مثلاً جسمانی محنت سے نفرت، بنیادی پیداوار سے چڑ، دیہی زندگی کے لیے حقارت وغیرہ وغیرہ۔ جب تک تمام تعلیم یافتہ لوگ خود کو ملک کا خادم نہیں گردانتے، جس کے معنی ہی عوام کا خادم ہونے کے ہیں، اس وقت تک نہ کافی مقدار میں رہنمائی نصیب ہوگی اور نہ کارکردگی کا ابلاغ ممکن ہوگا جس کے بغیر بھارت کے پانچ کروڑ دیہاتوں میں بیروزگاری یا غیر پیداواری اسامیوں کا مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔

تحریک اور علم کارکردگی کے بعد سرمایے کا مسئلہ آتا ہے جو علم کارکردگی سے قریبی تعلق رکھتا ہے میرے اندازے کے مطابق بھارت میں پانچ کروڑ اسامیاں نکالنے کی فوری ضرورت ہے۔ اس صورت میں بھارت کو سب سے بڑا اجتماعی فیصلہ ٹکنالوجی کے انتخاب کے بارے میں کرنا ہوگا۔ بحث وتمحیص تو ہر شے کے متعلق ہوسکتی ہے لیکن عارضی کے بارے میں کیسے اختلاف ہوسکتا ہے۔ بڑے پیمانے پر سرماہ کاری کے ذریعے کم آسامیاں نکلیں گی جب کہ چھوٹے پیمانے کی سرماہ کاری کے ذریعے آپ بہت سی اسامیاں نکال سکتے ہیں۔

بھارت میں تقریباً پانچ کروڑ طلباء پرائمری جماعتوں میں، کم وبیش ڈیڑھ کروڑ ثانوی سکولوں میں اور اندازاً پندرہ لاکھ طلباء اعلیٰ جماعتوں پر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس سطح پر تعلیمی نظام کو برقرار رکھنے کا کوئی مفہوم نہ ہوگا جب تک کہ اختتام پر ان کے لیے کرنے کو کچھ نہ ہو جہاں وہ اپنے علم کا اطلاق کرسکیں۔ اگر یا سا نہ ہو تو ساری تعلیمی کاوشیں بے معنی ثابت ہوں گی۔ اس پیمانے پر تعلیمی کاوشوں کے معنی یہ ہیں کہ کم ازکم سال کی پچاس لاکھ آسامیاں نکالی جائیں، صرف چند لاکھ اسامیاں بے کار رہوں گی۔

زندگی کی لازمی اور عام اشیا مثلاً کھانا، کپڑ، مکان اور تہذیب کے متعلق آج یہ سوچا جاتا ہے کہ انہیں بھی آج کے نمونوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ تاہم آج کے نمونے غریبوں کو فراہم نہیں ہسکتے کیوں کہ ان کے لیے دولت درکار ہے۔ ماہرین عام طور پر اسے نظرانداز کر جاتے ہیں۔ یہ سوال کہ آپ ایک کارخانے کے لیے کتنی رقم مختص کرسکتے ہیں جب کہ کارخانوں کی ضرورت لاکھوں کی تعداد میں ہو، کبھی اُٹھایا ہی نہیں جاتا۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے، جو پچھلے ستر اسی برسوں میں پیدا ہوئی ہیں، لمبی چھلانگ لگانے کی ضرورت ہے۔ انسانی تاریخ میں موجودہ

صدی کی شروعات تک ایک عام تسلسل جاری تھا۔ لیکن ستر، اسی برسوں میں ایک ایسی لمبی چھلانگ لگانے کی ضرورت ہے۔ انسانی تاریخ میں موجودہ صدی کی شروعات تک ایک عام تسلسل جاری تھا۔ لیکن ستر، اسّی برسوں میں ایک ایسی لمبی چھلانگ لگائی گئی جس کا اندازہ فورڈ موٹر کمپنی کے ۳۰۹۱ء کے سرمائے (تیس ہزار ڈالر) سے ۳۶۹۱ء کے سرمایے (چھ ارب ڈالر) تک پہنچنے سے لگایا جاسکتا ہے۔

کسی ترقی پذیر ملک میں ۳۰۹۱ء کی سطح کے ہنری فورڈ نہیں مل سکت۔ ایسے سپر ہنری فورڈ، جو کسی مقام سے شروعات کیے بغیر ۳۶۹۱ء کی سطح پر آجائیں، ممکنات سے باہر ہیں کوئی شخص بھی اس سطح سے شروعات نہیں کرسکتا اس کے معنی یہ ہوئے کہ کوئی شخص بھی اس سطح کا کوئی کام نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ اس مقام پر نہ پہنچ چکا ہو اور اس سطح پر کام نہکر رہا ہو۔ جدید دنیا کو سمجھنا کے لیے اس حقیقت کا ادراک بہت ضروری ہے۔ اس سطح پر کوئی نیا کام نہیں ہوسکتا، صرف پرانے کی توسیع ہوسکتی ہے۔ اب اگر غریبوں کو اس سطح سے منسلک کردیا جائے تو وہ دولت مندوں کے اتنے زیادہ محکوم ہوجائیں گے جتنا وہ انسانی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئے۔ ایسی صورت میں وہ محض امیروں کا خلاء پر کرنے والے بن جائیں یعنی محض ایسی چھوٹی موٹی چیزیں پیدا کرسکیں گے جو سستی محنت کے باعث سستے داموں بن سکیں۔ امیر ممالک سے ایسی آوازیں سنی جائیں گی: ''اس غریب ملک یا اُس غریب ملک میں اُجرت اتنی کم ہے کہ ہم برطانیہ کے مقابلے میں وہاں سے ھڑی کا کوئی پرزہ یا کاربوریٹر کا کوئی جز زیادہ سستے داموں میں بنواسکتے ہیں۔ لہٰذا ہانگ کانگ یا تائیوان یا جہاں کہیں بھی یہ ممکن ہو وہاں سے بنوالیں۔'' یوں دیکھیے تو غریبوں کا کام یہ رہ گیا کہ وہ امیروں کی ضروریات کو خلاء پر کرتے رہیں۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ٹکنالوجی کی اس سطح پر ہم نہ تو مکمل آزادی حاصل کرسکتے ہیں اور نہ ہی مکمل طور پر روزگار مہیا کرسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ٹکنالوجی کا انتخاب دوسری چیزوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹکنالوجی کے سلسلے میں کوئی انتخاب کر ہی نہیں سکتے۔ میں نے امریکہ کے ایک مشہور ماہر اقتصادیات کا مقالہ پڑھا جس میں اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ آج کسی خاص چیز کو پیدا کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے ۱۷۹۱ کا طریق۔ کیا پہلے سامان نہیں بنائے جاتے تھے؟ زندگی کی بنیادی ضروریات تو اس وقت سے پیدا ہورہی ہیں جب حضرت آدم جنت سے زمین پر اُترے تھے مگر یہ حضرت ہمیں یہ بتاتے

ہیں کہ جو مشین بنائی جاسکتی ہے وہ محض جدید ترین مشین ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو مشین آج ''آسانی'' بن سکتی ہے وہ محض جدید ترین مشین ہے۔ یہ سچ ہے کہ کسی خاص وقت میں ایک ہی قسم کی مشینیں بازار پر چھا جاتی ہیں اور یہ تاثر پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمارے پاس انتخاب کی گنجائش ہی نہیں ہے، نیز یہ کہ کسی معاشرے میں جتنا سرمایہ ہوگا اُسی کے مطابق اس میں ''روزگار'' کا تعین ہوگا۔ یہ بات مضحکہ خیز ہے اور مقالہ نگار بھی یہ جانتا ہے کہ یہ مضحکہ خیز ہے۔ تاہم وہ بہ جلد اپنی غلطی کو درست بھی کر لیتا ہے اور جاپان، کوریا، تائیوان وغیرہ کی مثال پیش کرتے ہوئے یہ بتاتا ہے کہ وہاں لوگوں نے روزگار اور پیداوار کی اعلیٰ تر سطح بہت معمولی سرمائے سے حاصل کر لی ہے۔

ٹکنالوجی کے انتخاب کی ضرورت آہستہ آہستہ ماہرین اقتصادیات اور ترقیاتی منصوبہ ساز بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس سلسلے کی چار منزلیں ہیں۔ پہلی منزل تو وہ تھی جب تمام لوگ ایسے کا مذاق اُڑاتے اور ان کے تصورات کو مسترد کر دیتے جو اس موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ دوسری منزل یہ ہے کہ اب لوگ کم از کم زبان سے اس تصور کی تائید کرنے لگے ہیں۔ تاہم ابھی کوئی عملی کام شروع نہیں ہوا۔ تیسری منزل وہ ہوگی جب ٹکنالوجی کے انتخاب کے متعلق علم کو تیزی سے پھیلایا جائے گا اور چوتھی منزل اس کے عملی اطلاق سے متعلق ہوگی۔ یہ سفر بہت طویل ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ سیاسی مصالح کی بنا پر چوتھی منزل فوراً آجائے۔ اگر کوئی ایسا سیاسی نظریہ قائم ہو جائے جو ترقیاتی کاموں کا مقصد عوام کی فلاح قرار دے تو اس صورت میں لاکھوں عوام کی جدت طبع کی مدد سے چوتھی منزل پر براہِ راست پہنچا جاسکتا ہے۔ آج بھی ایسے ممالک موجود ہیں جو اس چوتھی منزل پر براہ راست پہنچ رہے ہیں۔

بہرحال ہمیں سیاست کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ اگر یہ بات لوگوں کی سمجھ میں آرہی ہے کہ ٹکنالوجی کا انتخاب آج بنیادی اہمیت اختیار کر گیا ہے تو دوسری منزل سے تیسری منزل کی طرف، یعنی زبانی تائید سے اصل کام کی طرف، کیسے پہنچا جائے؟ ایک ادارہ نجی طور پر کام کر رہا ہے، (اوسط ٹکنالوجی ترقیاتی گروپ)۔ کچھ کام تجارتی بنیادوں پر بھی ہو رہا ہے لیکن منظّم طور پر نہیں۔ اوسط ٹکنالوجی ترقیاتی گروپ نے اپنے ذمے یہ کام لیا ہے کہ یہ اندازہ کیا جائے کہ ٹکنالوجی کے انتخاب کی کیا کیا صورتیں ہیں۔ اس سلسلے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج کی انتہائی شدید صورت حال میں یہ قطعی ناکامی ہے کہ محض ایک گروپ نجی طور پر یہ خدمت سرانجام دے۔

ایسی درجنوں منظّم جماعتیں، جن میں تعلیم یافتہ لوگ سرگرمی سے حصہ لیں اور جنہیں کافی فنڈ میسر ہوں، ساری دنیا میں سرگرم عمل ہونی چاہییں۔ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ بھارت میں یہ کام بڑے پیمانے پر سرگرمی سے شروع کیا جائے گا۔ بہرحال یہ خوشی کی بات ہے کہ اس کی ابتدا ہو چکی ہے۔

اب میں چوتھے مسئلے یعنی منڈی کی طرف آتا ہوں۔ یہ ایک حقیقی مسئلہ ہے کیونکہ غربت کا مطلب یہ ہے کہ منڈی میں مال کی کھپت کے لیے آزاد قوتِ خرید بہت کم ہے۔ اگر ہم کسی غریب علاقے میں جوتوں کی پیداوار شروع کریں تو اس علاقے کے ہمارے مفلس ساتھیوں میں انہیں خریدنے کی قوت نہیں ہوگی۔ پیداوار زیادہ آسان ہے، اس کی کھپت نسبتاً مشکل کام ہے۔ ایسے موقع پر ہمیں یہ مشورہ ملتا ہے کہ مال برآمد کے لیے پیدا کرو۔ برآمد ہمیشہ امیر ملکوں کے لیے ہوتی ہے جن کے پاس خریدنے کے لیے خاصی رقم ہوتی ہے۔ اب اگر میں اپنا معمولی کام کسی دیہی علاقے میں شروع کروں تو میں دنیا کی منڈی میں دوسروں سے مقابلہ کیسے کر سکتا ہوں؟ برآمد کے بھوت کو خود پر سوار کر لینے کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں: ایک میں تو صداقت ہے لیکن دوسری بے بنیاد ہے۔ پہلے اس دوسری وجہ کو سمجھ لیں۔ یہ دراصل استعماری دور کا اقتصادی نشے کا خمار ہے۔ استعماری قوت کسی ملک میں اس لیے نہیں پہنچتی تھی اُسے وہاں کے باشندوں سے کوئی دلچسپی ہوتی تھی۔ اُسے تو اپنی صنعتوں کے لیے خام مال کی ضرورت تھی۔ اسی ضرورت نے ان کے پورے فکری نظام کو ڈھالا تھا۔

''ترقیات'' کے معنی خام مواد یا غذا کی رسد یا تجارتی منافع کی ترقی کے ہیں۔ استعماری قوت بنیادی طور پر رسد اور منافع میں دلچسپی رکھتی تھی دیسی باشندوں کی ترقی میں نہیں___ اس بات کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ملک کے خام مال کی برآمد چاہتے تھے، انہیں ملک کی اندرونی منڈی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسی نقطۂ نظر کے باعث یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی ترقی پذیر ملک میں برآمدات کی زیادتی ہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ تاہم لوگ محض برآمدات کے ذریعے زندہ نہیں رہتے۔ وہ اپنے لیے یا اپنے بھائیوں کے لیے جو کچھ پیدا کرتے ہیں اُسے زیادہ اہم سمجھتے ہیں بہ نسبت اس پیداوار کے جو وہ باہر والوں کے لیے پیدا کرتے ہیں۔

اب پہلی وجہ پر آ جایئے۔ اگر ہماری پیداوار برآمد کے لی ہو تو قوتِ خرید کے بارے میں ہمیں یقین ہوگا لیکن اگر ہم غریب ملک میں پیداوار شروع کریں تو مقامی طور پر مال کی کھپت محض اس وقت ہو سکتی ہے جب ہم کسی دوسری پیداوار سے قوتِ خرید کو اپنی جانب لے آئیں۔ مثلاً اگر

ایک درجن مختلف قسم کی چیزیں پیدا کی جانے لگیں تو بارہ پیدا کرنے والوں میں سے ہر ایک کیل یے دوسرے گیارہ کھپت کے لیے بازار بنجائیں گے۔ لیکن بہت سے کام ایک ساتھ شروع کرنا مشکل امر ہے۔ لہٰذا روایتی مشورہ یہی ہوگا کہ ''برآمد کے لیے پیداوار ہی صحیح ترقی ہے۔'' برآمدات کے لائق پیداوار کا محق تناظر ہی محدود نہیں روزگار پر بھی اس کا اثر محدود ہی ہوگا۔ دنیا کی منڈیوں میں مقابلے کے لیے یہ ضروری ہے کہ امیر ملکوں کی اعلیٰ مشینیں، جن میں کم سے کم مزدوروں کی کھپت ہو، نصب کی جائیں۔ پھر یہ کہ حاصل ہونے والی رقم بڑھ نہیں سکتی۔ ہم زرمبادلہ حاصل کرنے کے لیے برآمدات کرتے ہیں اور زرمبادلہ کو درآمدات پر یا قرضوں کی ادائیگی پر خرچ کردیتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلاّ ___

بہت سے پیداواری کاموں کو بیک وقت شروع کرنا مشکل ہے لیکن اس مشکل کو عوامی ترقیاتی کاموں کی مدد سے کم کیا جاسکتا ہے۔ بڑے پیمانے پر عوامی ترقیاتی پروگراموں کو اسامیوں کی فراہمی کے سلسلے میں قابل تعریف سمجھا جاتا ہے۔ میں اس میں محض ایک نکتے کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر آپ دیہاتوں میں عوامی ترقیاتی پروگراموں کے ذریعے، جنہیں بیرونی امداد حاصل ہوتی ہے، نئی قوت خرید پیدا کرسکتے کاموں سے منسلک افراد اپنی تنخواہ کو ''سامانِ استعمال'' خریدنے پر صرف کرتے ہیں۔ اگر یہ سامان مقامی طور پر پیدا ہوں تو یہ نئی قوتِ خرید جو ترقیاتی کاموں نے پیدا کی ہے باہر نہیں جائے گی بلکہ رقم مقامی بازار میں گردش کرتی رہے گی۔ عوامی ترقیاتی پروگرام بہت کارآمد ہوتے ہیں تاہم اگر انہیں سامانِ استعمال کی مقامی پیداوار کا تعاون حاصل نہ ہو تو رقم درآمدات پر صرف ہوجائے گی۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ تصور کہ برآمدات ترقیات کے لیے بہت اہم ہیں گمراہ کن ہے۔ پوری انسانیت کو ذہن میں رکھیں تو برآمدات کے کوئی معنی نہیں۔ انسان نے مریخ یا چاند سے زرمبادلہ حاصل کرکے ترقی نہیں کی۔

ایک مفہوم میں آج کام کرنا اتنا آسان ہوگیا ہے جتنا انسانی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں تھا۔ اس لیے کہ آج علم زیادہ ہے، ذرائع رسل ورسائل زیادہ ہیں لہٰذا ہمیں مشکلات سے بوکھلانا نہیں چاہیے۔ ہمیں اس عام فہم تصور کو اپنانا چاہیے کہ کام کرنا دنیا میں سب سے زیادہ فطری بات ہے، شرط یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ چالاکی ہمیں معذور نہ بنادے۔ میرا خیال ہے کہ وہ احمق آدمی جو یہ کہتا ہے کہ ''کچھ ہونا کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے''۔ اس چالاک آدمی سے بہتر ہے جو کسی ایسی

MashalBooks.com

چیز کو چھوئے کا بھی نہیں جب تک کہ وہ نہایت اعلیٰ نہ ہو۔ ہمیں جو چیزیں فوری عمل سے روکتی ہیں وہ نظریات اور منصوبہ بندی کمیشن میں ایسے ماہرین دیکھے ہیں جنہیں اس بات کا یقین ہے کہ آئندہ پندرہ برسوں میں بھی بھارتی محنت کش قوت کو کام پر نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ سوچنا کہ ایک بنیادی کام پندرہ برسوں میں نہیں ہوسکتا عقل کا زوال ہے۔ یہ کام کیوں ممکن نہیں؟ ان کے پاس اس کی نہایت اعلیٰ دلیل ہے۔ انہیں یہ معلوم ہوگیا ہے کہ کسی شخص کو کام پر لگانے کے لیے آپ کو اتنی بجلی، اتنا سیمنٹ اور اتنے فولاد کی ضرورت ہے۔ یہ احمقانہ بات ہے۔ میں آپ کو یہ یاد دلاتا چلوں کہ سوسوا سو سال پہلے بجلی، سیمنٹ اور فولاد کسی قابل ذکر مقدار میں موجود ہی نہیں تھے۔ (تاج محل بجلی، سیمنٹ اور فولاد کے بغیر بنا تھا اور اسی طرح یورپ کے تمام کلیسا) ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم انسانوں کی بنیادی ضروریات کی بات کر رہے ہیں اور اس صورت حال میں ہمیں مشکل اور پیچیدہ تصورات سے گمراہ نہ ہونا چاہیے اور بالکل ابتدائی اور سیدھے سادھے کاموں کو سرانجام دینے میں انہیں رکاوٹ نہ بننے دینا چاہیے۔

اس ڈر سے کہ کہیں آپ مجھے غلط نہ سمجھ لیں میں آپ کو اپنی مد آپ کی ایک بہت ہی سادہ مثال دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر کسی کو اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے اُسے اتنے متنوع درخت دیے ہیں جو ساری دنیا میں اپنی مثال آپ ہیں۔ انسانوں کی تمام تر ضروریات کے لیے درخت موجود ہیں۔ مہاتما بدھ بھارت کے عظیم ترین بزرگوں میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کو یہ تلقین کی تھی کہ ہر دھ ہر پانچ برسوں بعد ایک درخت لگائے گا اور اسے مستحکم کرے گا۔ جب تک یہ ہوتا رہا اس وقت تک سارا بھارت درختوں سے ڈھکا رہا۔ اسی کے طفیل بھارت میں چہار جانب صاف شفاف فضا، پانی کی کثرت، سائے کی افرائط، خوراک اور دیگر اشیائے ضرورت کی بہتات رہتی تھی۔ ذرا سوچیے اگر آپ بھارت میں آج پھر یہ تصور قائم کر دیں کہ ہر صحت مند آدمی۔ مرد، عورت، بچے سب کا یہ فرض ہے کہ وہ پانچ برسوں تک ہر برس ایک پودا لگائیں اور محفوظ رکھیں تو پانچ برس بعد آپ کو دو سو کروڑ مضبوط درخت ملیں گے۔ ہر شخص یہ حساب لگا سکتا ہے کہ اس سے بھارت کو وہ فاید پہنچے گا جو کسی پنج سالہ منصوبے سے نہیں پہنچتا۔ اس کام میں بیرونی امداد کا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوگا۔ نہ بچت کا کوئی مسئلہ ہے نہ سرمایہ لگانے کا۔ اس سے پیدا کیا ہوگا: خوراک کا سامان، دھاگے، تعمیرات کا سامان، سایہ، پانی، غرض ہر وہ شے جس کی انسان کو واقعی ضرورت ہوتی ہے۔

میں اسے محض ایک تصور کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ یہ بھارت کے لاتعداد مسائل کا جواب نہیں ہے مگر میں ایک بات پوچھتا ہوں: آخر یہ کیسی تعلیم ہے جو ہمیں اس کام سے بھی روکتی ہے جو ہم فوری طور پر کر سکتے ہیں؟ وہ کون سی چیز ہے جو ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ کسی کام کو کرنے کے لیے ہمیں یقینی طور پر بجلی، سیمنٹ اور فولاد کی ضرورت ہے؟ ایسے کام، جو صحیح معنوں میں ہماری مدد کریں، ہمیشہ حکومت کے کرنے کے نہیں ہوتے۔ انہیں بڑی بڑی تنظیمیں بھی نہیں کر سکتیں۔ انہیں تو محض عوام ہی کر سکتے۔ انہیں بڑی بڑی تنظیمیں بھی نہیں کر سکتیں۔ انہیں تو محض عوام ہی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم یہ جان لیں کہ اس دنیا میں پیدا ہونے والے ہر شخص کے لیے سب سے فطری بات یہ ہے کہ وہ پیداواری کاموں میں اپنے ہاتھوں کا استعمال کرے، اور یہ بات بعید از عقل بھی نہیں ہے کہ ہر آدمی اس بات کو ممکن بنا سکے، تو پھر بے روزگاری کا مسئلہ خود بخود ختم ہو جائے گا اور ہم اپنے آپ سے یہ پوچھیں گے کہ جس کام کی ضرورت ہے اسے ہم کس طرح سرانجام دے سکتے ہیں؟

MashalBooks.com

تنظیم اور ملکیت

مستقبل کی پیشن گوئی کرنے والی مشین

اس کتاب میں پیش گوئی کے مسئلے پر بحث اس لیے شامل کی جارہی ہے کہ یہ ان مابعدالطبیعیاتی ___ اوراسی لیے عملی ___ مسائل میں سے ایک ہے جن سے ہم آج دوچار ہیں۔ مستقبل کا علم رکھنے والے، منصوبے بنانے والے، پیش گوئی کرنے والے اور ماڈل بنانے والے آج سے پہلے اتنی تعداد میں کبھی نہیں ہوئے۔ ٹکنالوجی کی سب سے عجیب پیداوار کمپیوٹر تو ایسے نئے امکانات کا نقیب ہے جن کا آج اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آج لوگ ایسی مشینوں کا ذکر کر رہے ہیں جو مستقبل کی پیش گوئی کریں گی۔ کیا وہی مشینیں نہیں جن کے ہم منتظر تھے؟ ہر زمانے میں ہر آدمی مستقبل کو جاننے کا خواہش مند رہا ہے۔

قدیم چینی ''آئی چنگ'' سے، جس کا دوسرا نام ''کتاب تغیرات'' تھا، اور جو انسانیت کی قدیم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے، فال نکالتے تھے۔ ہمارے، بہت سے ہم عصر آج بھی یہی کر رہے ہیں۔ ''آئی چنگ'' کی بنیاد اسی عقیدے پر ہے کہ گو ہر شے ہر وقت تبدیل ہوتی رہتی ہے لیکن تغیر کو ثبات ہے اور تغیر بعض یقینی مابعدالطبیعیاتی قوانین سے مطابقت رکھتا ہے۔ ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ ایک وقت پھیلاؤ کا ہوتا ہے، ایک منظم کرنے کا اور عقل مند آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ کائنات کے اس عظیم آہنگ کو سمجھے اور اس کی مطابقت میں زندگی بسر کرے۔ اس وقت جب کہ دوسری قومیں پیش گوئی کے لیے انسانوں سے مدد لیتی تھیں چینی کتاب سے فال نکالتے تھے جس میں تغیر کے آفاقی اور لازمی قوانین کے نمونے درج تھے۔ یہ وہ قوانین قدرت تھے جن سے ساری فطرت مطابقت رکھتی ہے اور جن سے انسان بھی مطابقت رکھ سکتا ہے بشرطیکہ اس نے عقل یا مصائب کی مدد سے بصیرت حاصل کر لی ہو۔ آج کا جدید انسان کمپیوٹر سے مدد کا طالب ہے۔

پرانے پیش گوئی کرنے والوں اور کمپیوٹر کا موازنہ دلچسپ ضرور ہے لیکن ان میں مقابلہ محض فرق کے حوالے سے ہوسکتا ہے۔ پہلے کا تعلق اقدار سے ہے اور دوسرے کا محض مقدار سے۔ یونان کے ڈلفی کے مندر پر یہ عبارت کندہ تھی: ''خود کو جانو'' جب کہ کمپیوٹر پر یہ عبارت کندہ

ہونے کا امکان ہے: ''مجھے جانو''۔ یہ سوچا جا سکتا ہے کہ یونانی پیش گو اور آئی چنگ دونوں کا وجود کا انحصار مابعد الطبیعیات پر ہے جب کہ کمپیوٹر موجود حقیقت پر مبنی ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ کوئی مشین، جو مستقبل کے بارے میں اس پیش گوئی کر سکتی ہو، اس کی بنیاد بھی مابعد الطبیعیاتی مفروضوں پر ہی ہوتی ہے۔ اس میں مضمر بات یہ ہے کہ ''مستقبل موجود ہے''، متعین شدہ صورت میں اپنا وجود رکھتا ہے اور اس کو ظاہر کرنے اور فوکس میں لانے کے لیے بس اچھے آلات اور اچھے طریق کار کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارے ذاتی تجربات سے بعید ہے اس لیے ہم اسے مابعد الطبیعیاتی مفروضہ قرار دینے میں حق بجانب ہیں۔ اس میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ انسان مطلقاً آزاد نہیں، نہ ہی طے شدہ واقعات کی راہ تبدیل کرنے پر قادر ہے۔

اگر ہر بات کی پیش گوئی ہو سکے تو انسانوں کے پاس کسی عمل کے لیے کوئی تحریک باقی نہیں رہے گی۔ انہیں یہ معلوم ہوگا کہ مستقبل تو پہلے سے طے ہے اور اس پر انسانی عمل کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اگر ہر شے کے بارے میں پیش گوئی نہ ہو سکے تو انسان اس نتیجے پر پہنچے گا کہ کسی فیصلے کی کوئی عقلی بنیاد ہو ہی نہیں سکتی لہٰذا پہلے کی طرح اس صورت میں بھی اس کے پاس عمل کے لیے کوئی جواز نہیں ہوگا۔ دنیا میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں پیشن گوئی ممکن ہے اور کچھ ایسی ہیں جن کے بارے میں ایسا ممکن نہیں اور خالق کائنات کی مرضی یہ ہے کہ انسان ان میں امتیاز قائم کرنے کا اہم کام سرانجام دے۔

البتہ منصوبہ بندی کرنے والے اس مفروضے سے کام شروع کرتے ہیں کہ مستقبل موجود نہیں اور یہ کہ وہ کسی ایسے نظام کو نہیں برت رہے جو پہلے سے متعین ہو اور جس کے بارے میں پیش گوئی کی جا سکے۔ یہ کہ وہ اپنے طور پر چیزوں کو متعین کرے گے، نیز یہ کہ وہ اپنے منصوبوں کی مدد سے مستقبل کو اُس حالت میں نہ رہنے دیں گے جو ان کے منصوبوں کے بغیر ہوتی۔ تاہم یہی وہ حضرات ہیں جو مستقبل کی پیش گوئی کے لیے مشین کا سہارا لینے پر سب سے زیادہ تیار ہوتے ہیں۔

پیش گوئی

سوال یہ ہے: کیا پیش گوئی ممکن ہے؟ مستقبل کا تو حال میں کوئی وجود نہیں ہوتا پھر نا موجود چیز کے بارے میں پیش گوئی کس طرح کی جا سکتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ پورا علم تو محض ماضی کے بارے ہی میں ہی ہو سکتا ہے۔ مستقبل تو ہمیشہ زیر تعمیر ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تعمیر بالعموم موجود

مواد سے ہی ہوتی ہے جس کے بارے میں بہت کچھ بتایا جاسکتا ہے لہٰذا اگر ہمیں ماضی کا بھرپور علم ہو تو مکمل طور پر تو نہیں لیکن بڑی حد تک مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کر سکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مستقبل کی تعمیر میں وہ عنصر داخل ہو جاتا ہے جسے انسانی آزادی کہتے ہیں۔ یہ آزادی ایسے وجود کی آزادی ہوتی ہے جو خالق کی شباہت میں بنایا گیا ہے لہٰذا تخلیق کی آزادی کہہ سکتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ آج سائنس کے زیر اثر بہت سے لوگ اپنی آزادی کا استعمال اس لیے کرتے ہیں کہ اس کے وجود سے منکر ہو جائیں۔ اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے افراد اپنی انتہائی مسرتیں کسی ''میکانکیت''، کسی ''واقعے کی جبریت'' یا کسی ایسی شے کو بڑھا چڑھا کر پیش کر کے حاصل کرتے ہیں جہاں انسانی آزادی کا فقدان ہوتا ہے یا بظاہر نظر آتا ہے۔ جب کبھی کوئی شخص علم الابدان میں یا نفسیات میں یا معاشیات میں یا سیاسیات میں ''غیر آزادی'' کی کوئی اور شہادت دریافت کرتا ہے یا کوئی ایسی نشانی دیکھتا ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ انسان جو کچھ ہے وہی ہو سکتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے وہی کر سکتا ہے خواہ اس کا عمل کتنا ہی غیر انسانی کیوں نہ ہو تو ایک نعرۂ احسنت و مرحبا بلند ہوتا ہے۔ آزادی سے انکار کے معنی ذمہ داری سے انکار کے ہیں۔ کوئی عمل نہیں ہوتا محض واقعات سرزد ہوتے ہیں۔ بس کچھ آپ ہی آپ ہو جاتا ہے۔ ذمہ داری کسی کی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہمارے اس عقیدے کی ہے کہ جلد ہی ہمارے پاس ایسی مشین آجائے گی جو مستقبل کی پیش گوئی کر سکے گی۔

یہ بات یقینی ہے کہ اگر سب کچھ محض واقع ہو جائے، اگر آزادی، انتخاب، انسانی تخلیق اور ذمہ داری کے عناصر کا فقدان ہو جائے تو ہر شے کی پیش گوئی ہو سکتی ہے، الا اس کے کہ اتفاق یا ور جز وقتی طور پر علم کی کمی ہو۔ آزادی کے فقدان کے باعث انسانی معاملات فطری سائنس کے مطالعہ کے لیے سازگار ہوں گے یا کم از سائنسی طریق کار ان پر منطبق ہو سکے گا۔ یوں منظم طریقے پر حقائق کے مشاہدے کے باعث قابل اطمینان نتائج جلد از جلد حاصل کیے جاسکیں گے۔

تاہم انسانی آزادی اور ذمے داری کی مداخلت کے باعث، مابعد الطبیعیاتی اعتبار سے، معاشیات، طبیعیات سے مختلف ہو جاتی ہے اور انسانی معاملات بڑی حد تک ناقابل پیش گوئی ہو جاتے ہیں۔ البتہ ہم اس وقت پیش گوئی کر سکتے ہیں جب ہم اور دوسرے لوگ کسی خاص منصوبے کے تحت کام کر رہے ہوں۔ لیکن ایسا محض اس لیے ہوتا ہے کہ خود منصوبہ انتخاب کی آزادی کا مظہر ہوتا ہے یعنی آخری انتخاب ہو چکتا ہے اور تمام متبادل امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر انسان

منصوبے پر قائم رہیں تو اُن کے رویوں کی پیش گوئی ہوسکتی ہے اور وہ اس لیے کہ انسانوں نے یہ انتخاب کرلیا ہے کہ منصوبے کے علاوہ اور طرح کے عمل کی آزادی کو استعمال نہیں کریں گے۔

اصولی طور پر ہر وہ شے، جو انسانی آزادی کی مداخلت سے مبرا ہے، قابل پیش گوئی ہے، مثلاً ستاروں کی چال۔ مگر وہ چیز جس میں انسانی آزادی کی مداخلت ہوسکتی ہے ناقبل پیش گوئی ہے۔ تو کیا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تمام انسانی اعمال کی پیش گوئی نہیں ہوسکتی؟ جی نہیں۔ اس لیے کہ زیادہ لوگ، زیادہ اوقات میں اپنی آزادی کا استعمال کرتے ہی نہیں اور محض میکانکی طور پر کام کرتے رہتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جب ہم لوگوں کی کثیر تعداد کے ساتھ معاملت کر رہے ہوتے ہیں تو ان کے رویوں کے بہت سے پہلوؤں کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے کیوں کہ کثیر عوام کی ایک معمولی اقلیت ہی اپنی آزادی کی قوت کا استعمال کر رہی ہوتی ہے اس لیے وہ خاطر خواہ طور پر سارے نتائج پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ اہم اختراعات اور تبدیلیاں اقلیتی عمل کے ذریعے رونما ہوتی ہیں جو اپنی تخلیقی آزادی کے استعمال کر رہی ہوتی ہے اس لیے وہ خاطر خواہ طور پر سارے نتائج پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ اہم اختراعات اور تبدیلیاں اقلیتی عمل کے ذریعے رونما ہوتی ہیں جو اپنی تخلیقی آزادی کے استعمال کا اہل ہوتا ہے۔

پس یہ واضح ہے کہ معاشرتی تناظر میں آزادی کا عدم استعمال اُسے مستحکم اور قابل پیش گوئی بنا دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کی عوام کی اکثریت کسی موجودہ صورت حال کو کسی خاص وقت میں زیادہ تبدیل کرنے کی اہل نہیں ہوتی جب تک کہ ایسے اسباب نہ ہوں جو ان پر قابو حاصل کرلیں۔ اس سے ہم یہ نتائج نکلتے ہیں:

۱۔ مکمل پیش گوئی (اصولی پر) محض انسانی آزادی کے عدم استعمال سے ممکن ہے، یعنی کم تر درجے کی انسانی فطرت میں۔ پیش گوئی کے حدود محض علم اور طریق کار کے حدود ہیں۔

۲۔ اضافی پیش گوئی عوام الناس کے رویوں کے متعلق ہوسکتی ہے جو وہ عام زندگی میں ظاہر کرتے ہیں۔

۳۔ اضافی طور پر مکمل پیش گوئی اُن انسانی اعمال کے متعلق ہوسکتی ہے جو کسی منصوبے کے تحت ہوں اور جن سے انسانی آزادی خارج کردی گئی ہو، مثلاً ریلوے کا نظام الاوقات۔

MashalBooks.com

۴۔ فرد کے انفرادی فیصلوں کے بارے میں اصولی طور پر کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔

جزوقتی پیش گوئیاں

عملی طور پر تمام پیش گوئیاں پچھلے ریکارڈ کی بنیاد پر محض اندازہ ہوتی ہیں۔ یہ اندازہ کس بات کا اور کیسے لگایا جاتے ہے؟ فرض کیجیے کہ ترقیاتی کاموں کا کوئی کھاتہ موجود ہے تو آپ اندازہ لگانے میں کسی بات کو پیش نظر رکھیں گے؟

ترقی کی رفتار کے اوسط کو یا ترقی کی رفتار میں زیادتی کو یا مطلق طور پر سالانہ ترقی کو؟ سچی بات یہ ہے کہ اس کا کوئی قانون نہیں۔ یہ محض اپنے ''احساس'' اور رائے کا مسئلہ ہے۔ بہتر ہوگا ہم ان مختلف امکانات کے حوالے سے ایک ہی وقت میں کیے گئے انداز کو جان لیں کہ اس سے ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ ''اندازوں'' پر بہت زیادہ بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔ اسی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیش گوئی کے بہتر طریق کار بھی خرابیوں کا باعث بن سکتے ہیں۔ جزوقتی پیش گوئی کے سلسلے، مثلاً ایک سال کی پیش گوئی کے لیے اعلیٰ طریق کار قدیم طریق کار کے مقابلے میں نتائج میں کم ہی اختلاف کرتے ہیں۔ ایک سال کی ترقی کے بعد آپ پیش گوئی کر بھی کیا سکتے ہیں؟ یہی نا کہ:

۱۔ ہم نے مقررہ حد حاصل کر لی ہے۔

۲۔ ترقی اسی رفتار سے یا اس سے کم یا اس سے زیادہ ہوتی رہے گی۔ منزل ہوگا۔

ظاہر ہے ان بنیادی پیش گوئیوں میں انتخاب کسی ٹکنیک کے تحت ہونے کیبجائے کی بنیاد پر عقلی فیصلے کے مطابق ہوگا۔ اس کا دارومدار اس بات پر بھی ہے کہ آپ کسی چیز کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ اگر کوئی ایسی چیز ہے جو بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے، مثلاً بجلی کی کھپت، تو آپ کا انتخاب ان تینوں باتوں یعنی ایک ہی رفتار، زیادہ رفتار یا کم رفتار میں سے ایک ہوگا۔

لہٰذا مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے میں پیش گوئی کی ٹکنیک سے اتنی مدد نہیں ملے گی جتنی موجود صورت حال کی صحیح تفہیم سے مل سکتی ہے۔ اگر کارگزاریوں کی موجود رفتار (ترقی کی رفتار) پر ایسے غیر معمولی اثرات پر پڑ رہے ہیں جو آئندہ سال متوقع نہیں ہیں تو اس بات کی تفہیم ضروری ہے۔ اس قسم کی پیش گوئی کا کہ ''ویسی ہی جیسی پچھلے سال'' سے دونوں مطلب نکل سکتے ہیں: یہ بھی کہ ترقی ہوگی اور یہ بھی کہ اس سال غیر معمولی حالات کی بنا پر تنزل ہوگا۔ اس بات کو وضاحت سے بتانا چاہیے۔

MashalBooks.com

میں یہ سمجھتا ہوں کہ ساری کوششیں موجودہ صورتِ حال کو سمجھنے پر صرف کرنی چاہیے۔ غیر معمولی صورتِ حال کی وضاحت کرنی چاہیے اور اگر ممکن ہو تو اُسے ختم کر دینا چاہیے۔ اگر یہ ہو جائے تو پیش گوئی کا طریقہ فرسودہ نہیں رہے گا۔ کوئی اعلیٰ ٹکنیک اس بنیادی فیصلے تک پہنچنے میں مدد نہیں کر سکتی کہ آئندہ سال ویسا ہی ہوگا جیسا پچھلا سال یا بہتر بدتر؟

میں اس دعوے کو تسلیم کرتا ہوں کہ بہت نمایاں اور مضبوط موجودہ صورتِ حال (استحکام، ترقی یا تنزل کی صورت میں) زیادہ دیر تک یکساں طور پر قائم رہ سکتی ہے بشرطیکہ بعض ایسے عناصر کا مکمل علم ہو جائے جو آئندہ اسے تبدیل کر سکتے ہوں۔ مستحکم، واضح اور مستقل صورت حال کے نمونوں کو دریافت کرنے کے لیے انسانی ذہن اپنے الیکٹرانک حریف کمپیوٹر کے مقابلے میں زیادہ سستا، زیادہ تیز اور زیادہ قابل اعتماد ہوتا ہے۔ اسی بات کو ہم دوسری طرح بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ریاضیاتی تجزیے کے اعلیٰ طریق کار کو کسی نمونے کی دریافت کے لیے استعمال کرنا اتنا ضروری ہو جائے کہ ہمیں الیکٹرانک کمپیوٹر کی ضرورت پڑے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے نمونے نہایت مبہم اور کمزور ہیں اور حقیقی زندگی میں ان کا اندازہ لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اگر موجودہ صورتِ حال سے غیر معمولی عناصر کا خاتمہ کر دیا جائے تو پیش گوئی کے فرسودہ طریقے ماہرین اعداد و شمار کی دو بنیادی خرابیوں سے پاک ہوں گے۔ اول جعلی صداقت، دوم جعلی وضاحت۔ آپ کے پاس ایک فارمولا ہو اور ایک الیکٹرانک کمپیوٹر، پھر کیا ہے، لیموں کو اتنا نچوڑا جائے گا کہ وہ بالکل خشک ہو جائے گا اور مستقبل پر ایمان لانا پڑے گا۔ لیکن وہ شخص جو ایک خیالی نقشے کو صحیح سمجھ کر استعمال کرتا ہے اس شخص کے مقابلے میں زیادہ گمراہ ہے جس کے پاس کوئی نقشہ ہی نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ کسی مناسب جگہ سے معلومات حاصل نہیں کرے گا۔ راستے کی تفاصیل کا بغور مشاہدہ نہیں کرے گا اور نہ اپنے پورے حواس اور اپنی عقل کو کام میں لاتے ہوئے ان نشانیوں کو تلاش کرے گا جو اُسے منزل تک پہنچانے والی ہیں۔

جو شخص پیش گوئی کرتا ہے بہر حال ان مفروضوں کو سمجھتا ہے جن کی بنا پر اس نے پیشن گوئی کی ہے لیکن جو شخص پیشن گوئی کو استعمال کرتا ہے ہو سکتا ہے کہ اس کو اس بات کا تصور بھی نہ ہو کہ پیش گوئی کا سارا ڈھانچہ کسی غلط مفروضے کی وجہ سے گر سکتا ہے۔ وہ اس بات پر مطمئن ہوتا ہے کہ سارا کام نہایت تفصی اور وضاحت سے کیا گیا ہے۔ اس کے بغیر اسے کم از کم یہ علم تو ہوتا ہے کہ پیش گوئی ہو یا نہ ہو کسی نہ کسی کو تو مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے۔

منصوبہ بندی

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ منصوبہ بندی پیش گوئی سے مختلف چیز ہے۔ یہ ارادوں کا بیان ہے یعنی منصوبہ بندی کرنے والے یا حکام بالا کے ارادوں کی تفصیل۔ منصوبہ بندی طاقت سے منسلک ہوتی ہے۔ یہ فطری اور قابل تحسین بات ہے کہ جس کے پاس طاقت ہو اس کے پاس کوئی نہ کوئی منصوبہ بھی ہونا چاہیے۔ یعنی یہ کہ اسے طاقت کا استعمال شعوری طور پر بالارادہ کرنا چاہیے اور وقت سے کسی قدر آگے دیکھنا چاہیے۔ ایسا کرتے وقت اُس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ دوسرے لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ کوئی منصوبہ بلا کسی پیش بینی کے بنا ہی نہیں سکتا۔ یہ بات تو سیدھی سادھی ہے لیکن پیش بینی پیش گوئی کا تعلق ان معاملات سے ہونا چاہیے جن میں انسانی آزادی کی مداخلت نہیں ہوتی یا پھر ایسے معمولات سے جن کا تعلق عوام کی کثیر تعداد سے ہوتا ہے یا پھر اُن متعین منصوبوں سے جو دوسرے طاقتور لوگ چلا رہے ہوں۔ بدقسمتی سے پیش گوئی جن امور کے بارے میں کی جاتی ہے ان کا تعلق ان شقوں سے نہیں ہوتا۔ ان کی بنیاد کسی فرد یا چند اشخاص کے کیے ہوئے فیصلوں پر ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال میں پیش گوئی ''الہامی شبہات'' سے کچھ ہی زیادہ ہوتی ہے۔ پیش گوئی کی ٹکنیک خواہ کتنی ہی اعلیٰ ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہو سکتا ہے بعض لوگ دوسروں سے بہتر اندازے لگا سکتے ہوں لیکن اس لیے نہیں کہ ان کے پاس بہتر ٹکنیک ہوتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کسی آزاد معاشرے میں ''قومی منصوبہ بندی'' کے کیا معنی ہیں۔ اس کے معنی یہ تو ہرگز نہیں ہوں گے کہ تمام طاقتیں کسی ایک مرکزی نقطے پر مرتکز ہو جائیں کہ یہ آزادی کے خاتمے کے مترادف ہوگا۔ صحیح قسم کی منصوبہ بندی طاقت کے ساتھ ہی فروغ پاتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ''قومی منصوبہ بندی'' کا مفہوم کسی آزاد معاشرے میں معاشی طاقت رکھنے والے تمام لوگوں کے ارادوں کا بیان ہے۔ اس قسم کے بیانات کو ایک مرکزی ادارہ اکٹھا کر کے یکجا کر لیتا ہے۔ اس قسم کے منصوبوں کے تفادات بھی بعض قیمتی اشاروں کے حامل ہوتے ہیں۔

طویل المدت پیش گوئیاں اور عملی امکانات کے مطالعے

اب ہم طویل المدت پیش گوئیوں کی طرف آتے ہیں جس سے ہماری مراد پانچ یا زیادہ

برس بعد کے متعلق اندازے لگانا ہے۔ی بات تو بالکل واضح ہے کہ وقت کا کام ہی تبدیلی لانا ہے اس لیے طویل المدت مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کا امکان کم مدت کے مقابلے میں اور زیادہ کم ہوتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ تمام طویل المدت پیش گوئیاں کج فہمی اور لغویت کی حامل ہوتی ہیں جب تک کہ وہ اتنی عام نہ ہوں کہ محض ظاہری باتوں کا اعلان کریں۔اس کے باوجود اس بات کی عملی ضرورت ہوتی ہے کہ مستقبل کا کوئی نہ کوئی جائزہ لیا جائے کیوں کہ مستقبل کے متعلق بعض فیصلے پہلے سے کرنے پڑتے ہیں۔بعض طویل المدت تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہمیں پہلے ہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔اس سلسلے میں کون سی چیز ہماری مدد کرسکتی ہے۔

یہ ضروری ہے کہ پیش گوئیوں اور امکانات کے جائزوں یا تفتیشی اعداد وشمار کے درمیان فرق کیا جائے۔ پہلی صورت میں تو ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اتنی مدت میں یا فرض کیجئے کہ بیس برسوں میں صورتِ حال اس طرح کی ہو جائے گی۔ دوسری صورت میں ہم محض بعض مفروضہ میلانات کے طویل المدت اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ بات صحیح ہے کہ بڑے پیمانے منصوبوں میں امکانات کا مطالعہ معمولی سطح سے آگے نہیں بڑھتا۔عام طور پر لوگ پیش گوئیوں پر ہی انحصار کرتے ہیں جو اس کاغذ کی قدر کی حامل بھی نہیں ہوتیں جن پر وہ درج ہوتی ہیں۔

مناسب ہوگا میں کچھ مثالیں بھی پیش کردوں۔آج کل ترقی پذیر ممالک میں ترقیات کے مسائل پر بڑی باتیں ہوتی ہیں اور اس مقصد کے لیے بے شمار (نام نہاد) منصوبے ساری دنیا میں تیار کیے جاتے ہیں۔ان توقعات کے مطابق، جو ساری دنیا میں پھیلائی جارہی ہیں، یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ آئندہ چند دہائیں میں دنیا کی آبادی کی کثیر تعداد کو وہی معیار زندگی نصب ہو جائے گا جو اس وقت مغربی یورپ کا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس منصوبے کے امکانات کا مناسب اور تفصیلی مطالعہ کرے تو یقیناً بہت سودمند ہوگا۔ وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے گا کہ بے شک ایسے تمام ممالک میں جن میں عوام الناس انتہائی مفلسی کی زندگی گزار رہے ہیں بڑے پیمانے پر ترقیاتی کام ہونے چاہییں تاہم مختلف ترقیاتی نمونوں میں سے انتخاب کرنا لازمی ہوگا اور وہی بروئے کار آسکے گا جو امکانی طور پر مناسب حال ہو۔ان میں سے بعض زیادہ مناسب ہوں گے اور بعض کم۔

طویل المدت غور وفکر اور اس کے ساتھ محتاط جائز امکانات ایسے خام مواد کے سلسلے میں جسے خود پیدا نہ کیا جاسکے مثلاً دھاتیں اور تیل انتہائی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت کوئلے کی جگہ تیل نے لے لی ہے۔لوگ یہ سوچنے لگے ہیں کہ کوئلہ ختم ہونے والا ہے۔ایسے موقع

پر محتاط مطالعاتی جائزہ جو کوئلے، تیل اور قدرتی گیس کے ذخاء سے متعلق تمام شہادتوں پر مشتمل ہو، جن کا وجود ثابت ہے، جن کے ہونے کا امکان ے، پر مشتمل ہو تو بہت زیادہ سبق آموز ہوگا۔

آبادی کے فروغ کے ساتھ زیادہ خوراک پیدا کرنے کے سلسلے میں محض اتنا بتانا کافی نہیں ہے کہ ہمیں ۱۹۹۰ میں یا ۲۰۰۰ء تک غذا کی پیداوار کو کتنا بڑھانا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تفصیل کے ساتھ بتایا جائے کہ اس سلسلے میں مستقبل قریب میں درجہ بدرجہ کیا اقدامات کیے جائیں گے تاکہ مقصد کا حصول ممکن ہو سکے۔

ان تمام صورتوں میں ضرورت واضح فکری عنصر کی ہے۔ یہ بات لازمی ہے کہ پیش گوئی اور امکانات کے مطالعاتی جائزہ میں فرق محسوس کیا جائے۔ یہ محض شماریاتی جہالت ہے کہ ان دونوں میں تمیز نہ رکھی جائے۔ طویل المدت پیش گوئی تو یقیناً بے بنیاد دعویٰ ہوتی ہے لیکن طویل المدت مطالعاتی جائزہ پر خلوص عاجزانہ عمل کا نتیجہ ہوتا ہے جس سے صرف نظر نقصان دہ ہوتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کیا اس قسم کا مطالعہ میکانکی امداد مثلاً الیکٹرانک کمپیوٹر کے استعمال سے آسانی سے کیا جا سکتا ہے؟ ذاتی طور پر مجھے اس میں شک ہے گو اس میں شک نہیں جو حساب کتاب کمپیوٹر منٹوں میں کر سکتا ہے کے لیے انسانی ذہن کو مہینوں سوچنا پڑے گا۔ تاہم اصل بات یہ ہے کہ غیر الیکٹرانک انسانی ذہن اس قسم کے کاموں میں پڑے گا ہی نہیں۔ وہ اپنی قوت فیصلہ کی مدد سے محض چند فیصلہ کن عناصر پر توجہ دے گا جو قابل فہم امکانات کی حدود کا تعین کر دیں گے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے مشین کے ذریعے طویل المدت پیش گوئیوں کا حصول زیادہ سودمند ہے۔ مشین میں مسلسل حالیہ ''خبریں'' بھرتے جائیں تو وہ مسلسل تبدیل شدہ طویل المدت پیش گوئیاں کرتی جائے گی۔ بلاشبہہ ایسا ممکن ہے۔ لیکن کیا یہ سودمند ہوگا؟ ہر ''خبر'' کی طویل المدت سے مطابقت کے متعلق پہلے آپ کو خود غور کرنا ہوگا۔ تاہم فوری طور پر صحیح فیصلہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ مجھے اس بات میں کوئی معنی نظر نہیں آتے کہ کسی طویل المدت پیش گوئی کو میکانکی معمولات کے طور پر مسلسل بدلا جائے۔ پیش گوئی کی ضرورت تو اس وقت پیش آتی ہے جب طویل مدت کا فیصلہ کیا جائے یا فیصلے پر نظر ثانی کی جائے۔ ایسا واقعہ تو بڑے سے بڑے منصوبوں میں بھی بہت کم پیش آتا ہے اور اگر پیش آئے تو یہ ضروری ہے کہ غور و خوض سے بہترین شہادتیں اکٹھی کی جائیں، ہر عنصر کو پچھلے تجربوں کی روشنی میں پرکھا جائے اور پھر ایسے نظریات قائم کیے جائیں جو بہترین ذہنوں کے نزدیک قابل قبول ہوں۔ یہ محض خود فریبی ہے کہ یہ محنت طلب اور غیر یقینی طویل عمل

محض مشینی کارکردگی سے مختصر کیا جاسکتا ہے البتہ جب امکانات کا مطالعاتی جائزہ لیا جائے تو بسا اوقات یہ بات فائدہ مند ہوگی کہ ایسی مشین استعمال کی جائے جو فوری طور پر بہت سے متبادل مفروضوں کے اثرات کا جائزہ لے سکے۔

ناقابل پیش گوئی اور آزادی

اگر میں معاشی پیش گوئی کے سلسلے میں ''خودکار نظام'' کی نفع بخشی کا منفی تصور رکھتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں الیکٹرانک کمپیوٹر یا اس قسم کی اور مشین کو دوسرے کاموں کے لیے قابل قدر نہیں سمجھتا۔ ہر قسم کے ریاضیاتی مسائل کے سلسلے میں یہ یقینی طور پر مفید ہے کیونکہ ان مسائل کا تعلق مطلق طور پر سائنسوں اور ان کے انطباق سے ہوتا ہے۔ ان سائنسوں کی مطلق صحت ہی انسانی آزادی، انسانی انتخاب، ذمہ داری اور حرمت کی غیر موجودگی کی علامت ہے۔ انسانی آزادی میں مداخلت ہے ہم ایک بالکل نئی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں میکانکی طرز عمل خطرناک ہو جاتا ہے۔ انسانی اور میکانکی عمل کے امتیاز کو ختم کر دینیوالے رجحانات سختی سے کچل دینے چاہییں۔ معاشرتی علوم پر فطری سائنسوں کے طریق کار کو منطبق کرنے کے گمراہ کن رجحان نے انسانی حرمت کو شدید طور پر مجروح کیا ہے۔ معاشیات اور اس سے بھی زیادہ اطلاقی معاشیات مکمل طور پر سائنس نہیں ہے۔ یہ سائنس سے کچھ زیادہ ہے اور صحیح معنوں میں ہونا بھی چاہیے۔ معاشیات کو آپ انسانی عقل کی ایک شاخ سمجھ لیجئے۔ مسٹر کولن کلارک نے ایک بار یہ دعویٰ کیا تھا کہ ''طویل المدت عالمی معاشی توازن خود اپنے منفرد انداز کا حامل ہوتا ہے اور سیاسی و معاشی تبدیلیوں سے مطلق آزاد ہوتا ہے۔'' اس مابعد الطبیعاتی گمراہ کن بیان کی بنیاد پر انہوں نے ۱۴۹۱ء میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ''۶۹۱۰ء کی معاشیات'' تھا۔ یہ کہنا بے انصافی ہوگا کہ جو تصویر انہوں نے کھینچی اس کی اُس دوران میں گزرے ہوئے واقعات سے کوئی مماثلت نہیں___ مماثلت یقیناً ہے مگر وہ اس لیے ہے کہ آدمی بہرصورت اپنی آزادی کا استعمال فطرت کے ناقابل تبدیل قوانین کے زیر اثر ہی کرتا ہے۔ لیکن مسٹر کلارک کی کتاب سے جو سبق ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا مابعد الطبیعیاتی مفروضہ سراسر غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عالمی معاشی توازن طویل مدت میں بھی سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں کے ہی تابع ہوتا ہے نیز یہ کہ پیش گوئی کے جو لطیف اور اختراعی طریق کار مسٹر کلارک نے اختیار کیے ان کے نتیجہ میں جعلی صداقت پر مبنی کتاب پیدا

ہوئی۔

نتیجہ

آخر میں اس خوش کن نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی، جس میں معاشی زندگی بھی شامل ہے، اب بھی دلآویز ہے کہ یہ بڑی حد تک ناقابل پیش گوئی ہے اور اسی لیے دلچسپ ہے۔ ماہر معاشیات اور ماہر اعداد وشمار کے بس میں یہ نہیں ہے کہ اسے ''ٹیپ'' کر لے۔ فطرت کے طبعی قوانین کی حدود میں ہم اب بھی اپنے انفرادی واجتماعی مقدر کے مالک ہیں خواہ اس میں بہتری ہو یا خرابی۔

ماہر معاشیات، ماہر اعداد وشمار، سائنسدان اور انجینئر کا طریق کار اور ماہر فلسفی کا علم ان حدود کی وضاحت میں ہمیں مدد دے سکتا ہے جن میں ہمارا مقدر محدود ہے۔ مستقبل کی پیش گوئی تو نہیں ہوسکتی لیکن اس کی چھان بین ہوسکتی ہے۔ امکانات کا مطالعہ یہ بتا سکتا ہے کہ ہم بظاہر کس سمت میں جا رہے ہیں۔ پہلے سے کہیں زیادہ یہ بات آج ضروری ہے کہ ''ترقی'' عالمی پیمانے پر معاشیات کا بنیادی راگ بن گئی ہے۔

بنیادی طور پر غیر یقینی مستقبل کے بارے میں فوری طور پر قابل اعتماد علم حاصل کرنے کی کوشش میں جدید باعمل انسان، پیش گوئی کرنے والوں کی بڑھتی ہوئی فوج اور واقعاتی تفاصیل کے بلند ہوتے ہوئے پہاڑوں، جو نت نئی مشینوں کے لیے غذا فراہم کرتے ہیں، میں گھر کر رہ جائے گا اور اس کا نتیجہ میری رائے میں محض یقین کا واہمہ ہوگا۔ بہترین فیصلہ صرف غیر الیکٹرانک بالغ ذہن ہی کر سکتے ہیں جو ایسے انسانوں کے پاس ہوتے ہیں جو سکون سے بغور کسی صورتِ حال کو مکمل طور سے دیکھتے ہیں۔ ''ٹھہرو، دیکھو اور سنو'' والا نصب العین ''پیش گوئیوں میں دیکھ لو'' سے زیادہ بہتر ہے۔

MashalBooks.com

کچھ بڑے پیمانے کی تنظیم کے بارے میں

آپس میں مدغم ہونے والا اور قومی ملکیت میں لیے جانے کے بارے میں ہم روزانہ کچھ نہ کچھ سنتے ہیں۔ برطانیہ یورپی اقتصادی برادری میں اس لیے شامل ہوا کہ بڑی تنظیم کے حوالے سے بڑی بڑی منڈیوں تک رسائی حاصل کر سکے۔ اشتہار اکی ممالک میں قومی ملکیت کے تصور نے بڑے بڑے ادغام اس لیے کیے کہ جو کچھ سرمایہ دار ممالک میں ہو رہا ہے اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔ ماہرین معاشیات اور ماہرین تجارت اس رجحان کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔

اس کے برعکس بہت سے ماہرین عمرانیات ونفسیات مستقل طور پر بڑی تنظیموں میں مضمر خطرات سے آگاہ کر رہے ہیں__ خطرات جو انسانی وجود کی اکائی کو لاحق ہیں۔ جب فرد یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ ایک بہت بڑی مشین کے پہیے کا ایک چھوٹا سا دندانہ ہے اور جب اس کے روزمرہ کام کی انسانی نوعیت غیر انسانی صورتِ حال میں بدل جاتی ہے۔ پھر وہ خطرات بھی جو اس کی صلاحیت کار اور صلاحیت تخلیق کو لاحق ہو جاتے ہیں اور جو بالعموم نوکر شاہی کے فروغ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

جدید ادب بھی ''بہادر نئی دنیا'' کی بھیانک تصویریں میں پیش کرتا ہے جو ''ہمیں'' اور ''اُنہیں'' میں تقسیم ہوگئی ہے۔ جو باہمی شکوک کی وجہ سے دو ٹکڑے ہوگئی ہے: نیچے سے اقتدار سے نفرت اور اوپر سے عوام کی حقارت۔ حاکموں کی طرف عوام کا رویہ غیر ذمہ داری کا ہے اور حاکم مضبوط تنظیم اور اشتراکِ عمل، تنخواہوں میں اضافوں کے لالچ، کام پر مائل کرنے کے نفسیاتی طریقوں لاتعداد تنبیہوں اور دھمکیوں سے کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

بلاشبہ یہ مسئلہ ابلاغ کا ہے مگر اصل اور مؤثر ابلاغ تو آدمی اور آدمی کے درمیان آمنے سامنے ہی ممکن ہے۔ فرانز کافا کا ناول ''قلعہ'' فاصلے سے نظم وضبط کے بھیانک اثرات کو بیان کرتا ہے زمین کی پیمائش کرنے والے مسٹر کے کو صاحبانِ اقتدار نے ملازم رکھ لیا ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کیسے اور کیوں۔ مسٹر کے اس صورتِ حال کی وضاحت چاہتے ہیں لیکن وہ جس کسی سے ملتے ہیں یہی کہتا ہے: ''بدقسمتی سے ہمیں زمین کی پیمائش کرنے والے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ایسے شخص کے لیے مطلق کوئی کام نہیں ہے۔''

اس کوشش میں کہ صاحب اقتدار سے ملاقات ہو جائے مسٹر کے بہت سے لوگوں سے ملتے ہیں جو بظاہر کچھ نہ کچھ حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم دوسرے لوگ انہیں بتاتے ہیں کہ ''تم ابھی تک ایک بار بھی صحیح صاحب اقتدار سے نہیں مل سکے ہو۔ تمہاری اب تک کی ساری ملاقاتیں محض واہمہ ہیں لیکن اپنی ناسمجھی کے باعث.....تم انہیں حقیقی سمجھ رہے ہو۔''

وہ صحیح کام سرانجام دینے میں بالکل ناکام رہتے ہیں یہاں تک کہ انہیں ''قلعے'' سے ایک خط ملتا ہے: ''پیمائش کا جو کام تم نے اب تک کیا ہے میں اس سے مطمئن ہوں.....اپنی کوششوں میں کمی نہ آنے دینا۔ اپنے کام کا خاتمہ بالخیر کرو۔ کسی قسم کی رکاوٹ میری ناراضگی کا باعث ہو گی.....میں تمہیں بھولوں گا نہیں۔''

حقیقت یہ ہے کوئی شخص بڑی تنظیم کا قابل نہیں ہے۔ کوئی شخص ایسے شخص سے احکام وصول نہیں کرنا چاہتا جو اپنے برتر شخص سے احکام لیتا ہے اور جو اپنے سے بدتر شخص سے.....اگر نوکر شاہی کے بنائے ہوئے ضابطے انسانیت سے لبریز ہوں تو بھی کوئی شخص ضابطوں کی حاکمیت نہیں چاہتا یعنی ایسے لوگوں کی حاکمیت جو ہر شکایت پر یہ جواب دیں: ''میں نے خود تو ضابطے نہیں بنائے، تو میں محض ان کا اطلاق کر رہا ہوں۔''

تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے پیمانے کی تنظیمیں قائم ہیں گی لہٰذا اب یہ ضروری ہے کہ ان کے بارے میں سوچا جائے اور نظریات قائم کیے جائیں۔ لہر جتنی تیز ہو جہاز رانی اتنی ہی ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔

بنیادی کام یہ ہے کہ بڑی تنظیم میں چھوٹے دائرۂ کار کیسے بنائے جائیں؟

ایک بار جب کوئی بڑی تنظیم وجود میں آجاتی ہے تو وہ گھڑی کے پنڈولم کی طرح مسلسل مرکزیت اور لامرکزیت کے ادوار سے گزرتی رہتی ہے۔ جب ایسے تضادات کا سامنا ہو جن میں دونوں جانب معقول دلاء موجود ہوں، تو پھر مسئلے کی تہہ تک پہنچنا چاہیے تاکہ کسی ایسے حل کا پتہ چلے جو محض سمجھوتہ نہ ہو، محض آدھا حل نہ ہو۔ ہوسکا ہے ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ''یہ یا وہ'' کے بجائے ''دونوں بیک وقت'' ہو۔

یہی مسئلہ ہماری پوری زندگی میں دخیل ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے جو ہمیشہ لیبارٹری کے مسائل سے خود کو متعلق رکھتے ہیں اور جہاں سے وہ ہر قسم کے غیر متعلق عناصر کو خارج کرتے رہتے ہیں، اس مسئلے کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہم حقیقی زندگی میں خواہ کچھ کریں ہمیں بہرحال ان ''نام نہاد''

غیر متعلق عناصر کے ساتھ بھی انصاف کرنا چاہیے جو کسی صورتِ حال کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ مزید برآں ہمیں تنظیم اور آزادی کے تقاضوں کو ہمہ وقت پورا کرتے رہنا چاہیے۔

ہر تنظیم میں خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی ایک طرح کا نظم وضبط اور وضاحت ہونی چاہیے۔ اگر ابتری پھیلی ہوئی ہو تو کوئی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ تاہم نظم وضبط زندگی سے عاری جمود ہوتا ہے اسی لیے یہ گنجائش بھی لازمی طور پر ہونی چاہیے کہ موجود نظم وضبط کو توڑا جا سکے، ایسا کام ہو سکے جو پہلے نہیں ہوا، نظم وضبط کے نگرانوں میں کے ذہن میں بھی کبھی نہیں سمایا، انسان کے تخلیقی تصورات کا نتیجہ، کوئی نیا خیال جس کی پیش گوئی نہ ہوئی ہو اور نہ کی جا سکتی ہو۔

لہٰذا ہر تنظیم کو نظم وضبط کے نظام اور تخلیقی آزادی کی بے تنظیمی کے لیے مسلسل کوشاں رہنا چاہیے بڑی تنظیموں میں خطرہ یہ مضمر ہوتا ہے کہ ان کا فطری میلان نظم وضبط کی طرف ہوتا ہے اور تخلیقی آزادی سے صرفِ نظر کر لیا جاتا ہے۔

ہم اس بنیادی تضاد یعنی نظم وضبط اور آزادی کے مماثل اور بہت سے متضاد رجحانات اکٹھے کر سکتے ہیں۔ مرکزیت کا تعلق نظم وضبط سے ہے جب کہ لامرکزیت کا تعلق آزادی سے ہے۔ تنظیم والا آدمی اکاؤنٹنٹ کی قسم کا ہو جاتا ہے اور عام طور پر منتظم ہوتا ہے کہ جب کہ تخلیقی آزادی کا حامل انسان تاجر یا کارخانے دار ہوتا ہے۔ تنظیم میں ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی سمت اعلیٰ کارکردگی کی طرف ہوتی ہے۔ جب کہ آزادی وجدان کا دروازہ کھولتی ہے اور ایجاد اور اختراع کی جانب لے جاتی ہے۔

تنظیم جتنی بڑی ہوگی اتنی ہی زیادہ نظم وضبط کی ضرورت ہوگی لیکن اگر اس ضرروت کی تکمیل اتنی شدت سے کی جائے کہ آدمی کے لیے تخلیقی وجدان کے استعمال کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے تو پوری تنظیم پر مژمردگی چھا جائے گی۔

یہ خیالات بڑے پیمانے کی تنظیموں کے بارے میں میرے اُس نظریے کا پس منظر ہیں جسے میں پانچ اصولوں کی صورت میں پیش کرنا چاہتا ہوں:

پہلا اصول: ''ذیلی معاونت کا اصول ہے۔'' اس اصول کو ان مشہور الفاظ کی شکل دی گئی ہے: ''یہ بے انصافی صحیح نظام میں رخنہ اندازی اور انتہائی خرابی کی بات ہے کہ جو کچھ ذیلی اور چھوٹی تنظیمیں کر سکتی ہیں وہ بس بڑی تنظیموں کے سپرد کر دیا جائے۔ ہر معاشرتی عمل کو فطری طور پر معاشرتی ڈھانچے کے ہر جزو کو تقویت دینی چاہیے اور انہیں جذب اور برباد نہیں کرنا چاہیے۔'' یہ

الفاظ بنیادی طور پر پوری معاشرت کے سیاق وسباق میں کہے گئے ہیں لیکن وہ کسی بڑی تنظیم کی مختلف سطحوں پر بھی منطبق ہو سکتے ہیں۔ بالائی سطح کے منصب کو اپنے اندر جذب کرے اور وہ بھی اس مفروضے پر کہ چونکہ وہ بڑی اور بلند تر ہے اس لیے وہ زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہر کر سکتی ہے۔ وفاداری نچلی اور ذیلی سطح سے بلند ہو کر بلائی سطحوں تک پہنچتی ہے، اس کے برعکس نہیں اور وفاداری کسی تنظیم کی صحت کا لازمی عنصر ہے۔

ذیلی معاونت کے اصول میں ہی بات مضمر ہے کہ ثبوت کی ذمہ داری محض ان کی ہے جو نچلی سطح کو اپنے منصب سے ہٹانا چاہتے ہیں اور اس طرح آزادی اور ذمہ داری سے بھی انہی کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ نچلی سطح اپنے منصب سے مناسب عہدہ برائی کے قابل نہیں ہے اور یہ کہ بالائی سطح پر وہ کام زیادہ بہتر طور پر سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس کو آگے بڑھاتے ہوئے ''سربراہوں کو اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ مختلف تنظیموں میں جتنا مکمل درجاتی نظام ہوگا (ذیلی معاونت کے اصول کے تحت) معاشرتی اقتدار اور اثر اتنا ہی مضبوط ہوگا اور ریاست میں اتنی ہی خوشی اور خوشحالی ہوگی۔''

اب مرکزیت اور لامرکزیت کا تضاد پیچھے رہ گیا ہے۔ ذیلی معاونت کا اصول ہمیں بتاتا ہے کہ اگر ذیلی ڈھانچے کی ذمہ داری اور آزادی کو مستحکم رکھا جائے تو مرکز کی قوت اور اس کا اثر زیادہ ہوگا اور اس کا یہ اثر ہوگا کہ پوری تنظیم زیادہ ''خوش اور خوشحال'' ہوگی۔

اس قسم کا ڈھانچہ کیسے تیار کیا جائے؟ منتظم کے نقطہ نظر سے تو نظم ونسق کی سختی اور مرکزیت کے بغیر کوئی نظام واضح منطقی بنیادوں پر استوار ہی نہیں ہو سکتا۔ تاہم ایسے ڈھانچے میں بڑی تنظیم بہت سی ذیلی تنظیموں میں بٹ جائے گی جو کسی حد تک خودمختار ہوں گی۔ انہیں بڑی حد تک آزادی ہوگی جس کے باعث تخلیقی صلاحیتوں اور تجارتی اختراعات کو پنپنے کا موقع ملے گا۔

مرکزی اقتدار کے بامعنی اور موثر ہونے کے لیے دوسرے اصول ''اصولِ مدافعت'' کا انطباق ضروری ہے۔ مرکز اور ذیلی ڈھانچوں کے تعلق کے بارے میں مرکز کا ایک فریضہ اس اصول میں مضمر ہے۔ ''مخصوص معاملات'' سے قطع نظر، ذیلی تنظیموں کی مکمل مدافعت مرکز کا فرض ہے۔ مرکز کو چاہیے کہ ذیلی تنظیموں پر عاید الزامات اور ان کے معاملات پر ہونے والی تنقید کا مکمل جواب دے اور ان کا دفاع کر کے انہیں تقویت پہنچائے۔ جہاں تک ''مخصوص معاملات'' کا تعلق ہے ان کی پوری وضاحت ہونی چاہیے تاکہ ذیلی فرم یہ جان سکے کہ وہ تسلی بخش انداز میں

اپنے منصب سے عہدہ برآ ہو رہی ہے۔

نظم و ضبط پر زور دینے والے منتظمین ہر شے کو اپنے قبضہ قدرت میں لا کر خوش ہوتے ہیں۔ کمپیوٹروں کی مدد سے آج وہ ایسا کرنے پر قادر ہیں۔ یہ حضرات بے شمار امور سے متعلق ذیلی تنظیموں کی جواب دہی پر زور دیتے ہیں۔ منطقی طور پر تو شاید یہ بات صحیح ہے مگر زندگی منطق سے بڑی چیز ہے۔ اگر جواب طلبی کے لیے بت سی باتیں ہوں تو ہر ذیلی شاخ میں کوئی نہ کوئی خرابی نکل آئے گی اور وہ کسی نہ کسی بات کے لیے ضرور جواب دہ ہوگی۔ ایسی صورت میں کسی شاخ کو کبھی یہ یقین نہ ہوگا کہ وہ واقعی تسلی بخش طور پر کام کر رہی ہے۔

''اصول مدافعت'' کے اطلاق کا اعلیٰ معیار یہ ہوگا کہ کسی تجارتی تنظیم میں جواب طلبی کے لیے محض ایک امر پیش نظر ہو، منافع ___ البتہ جہاں تک عام اصولوں اور پالیسیوں کا تعلق ہے ذیلی ڈھانچا مرکز کا پابند ہوگا۔ حقیقی دنیا میں گو آدرش کا حصول شاید ممکن نہیں لیکن آدرش کا تعین یقیناً بامعنی بات ہے۔ اس میں یہ بات مضمر ہے کہ اگر آدرش سے اختلاف کرنا ہی تو اس کے لیے بحث اور دلائل ضروری ہوں گے۔ جواب طالبی کے امور جب تک کم سے کم نہ ہوں گے ذیلی فرم میں تخلیقی اور اختراعی کوششوں کا دخل نہ ہوگا۔

تیسرا اصول ''اصول شناخت'' ہے۔ ہر ذیلی شاخ کے پاس نفع و نقصان کا حساب اور بیلنس شیٹ ہونی چاہیے۔ نظم و نسق کے اعتبار سے نفع و نقصان کا سٹیٹ منٹ کافی ہے کیونکہ اس سے یہ پتا چل جاتا ہے کہ شاخ پوری تنظیم کو نفع پہنچا رہی ہے یا نہیں۔

تجارت ہمیشہ مالی وسائل سے ہوتی ہے۔ یہ مالی وسائل نقصان کی صورت میں کم ہو جاتے ہیں اور منافع کی صورت میں بڑھ جاتے ہیں۔ مالی سال کے آخر میں شاخ کے نفع نقصان کا کیا ہوتا ہے؟ یہ تنظیمی ادارے کے حساب میں شامل ہو جاتا ہے۔ جہاں تک شاخ کا تعلق ہے اس کے لیے اُن کا کوئی وجود نہیں رہ جاتا۔ کسی بیلنس شیٹ کی غیر موجودگی میں ہر شاخ نئے مالی سال میں صفر بیلنس کے ساتھ داخل ہوتی ہے۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔

کسی شاخ کی کامیابی سے اس کی آزادی اور مالی مقاصد کو فروغ حاصل ہوتا ہے جب کہ ناکامی بصورتِ نقصان اسے کمزور اور نااہل بنا دیتی ہے۔ ایسی صورت میں کامیابی کی اعانت اور ناکامی کی نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیلنس شیٹ یہ بتاتی ہے کہ موجودہ نتائج کے باعث مالی وسائل میں اضافہ ہوا ہے یا کمی۔ اس سے متعلق لوگ وسائل پر کارکردگی کے اثرات کا جائزہ

لے سکتے ہیں۔ نفع اور نقصان کو یکسر ختم نہیں کر دیا جاتا بلکہ انہیں آگے لے جایا جاتا ہے لہٰذا ہر ذیلی شاخ کو ایسی بیلنس شیٹ رکھنی چاہیے جس میں نفع ''مرکز کو قرض'' کی صورت میں اور نقصان ''مرکز سے قرض'' کی صورت میں دکھایا جائے۔ یہ زبردست نفسیاتی اہمیت کا معاملہ ہے۔

اب میں چوتھے اصول کی طرف آتا ہوں اور وہ ہے ''اصولِ تحریک'' یہ ایک عام سی بات ہے کہ لوگ اپنے میلانات کے تحت کام کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک بڑے ادارے کے لیے، نوکر شاہی، دور افتادہ غیر ذاتی نظم ونسق، مجرد قوانین وضوابط کے باعث ''تحریک'' کا مسئلہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ بالائی سطح پر تو تحریک کا مسئلہ نہیں ہوتا لیکن جیسے جیسے ہم نچلے درجوں پر آتے جاتے ہیں یہ مسئلہ زیادہ سنگین ہوتا جاتا ہے۔ یہاں اس وسیع اور مشکل موضوع کی تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔

موجودہ صنعتی معاشرہ جس میں تنظیمیں ہیں اس موضوع پر بہت کم غور وفکر کرتا ہے۔ انتظامیہ یہ سمجھتی ہے کہ لوگ صرف پیسے کے لیے کام کرتے ہیں۔ محض تنخواہ کے لیے ایک حد تک تو یہ صحیح ہے لیکن جب کارکن سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ تم نے پچھلے ہفتے میں صرف چار شفٹوں میں کام کیوں کیا اور اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ''میں تین شفٹوں کی تنخواہ میں گزارہ نہیں کر سکتا تھا'' تو ہر شخص لاجواب ہو جاتا ہے۔

دانش ورانہ مغالطے اپنی قیمت وصول کرتے ہیں۔ ہم سخت محنت اور ضبطِ نفس کی خوبیاں گنواتے نہیں تھکتے اور پھر لامحدود مصرف اور اشیا کے استعمال کے خواب دکھاتے ہیں جس کے لیے نہ محنت کی ضرورت ہے اور نہ ضبطِ نفس کی۔ جب زیادہ محنت کی اپیل پر ہمیں یہ کھرا جواب ملتا ہے کہ ''میں اس سے کم تنخواہ میں گزارا نہیں کر سکتا''۔ تو ہم شکایت کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ایسی ہی خود کار مشینوں کے خواب دیکھتے ہیں جو انسانی محنت کو ختم کر دیں اور کمپیوٹر کی سوچتے ہیں جو انسانوں کو ذہن استعمال کرنے کے بوجھ سے نجات دلا دے۔

بہت سے لوگ کام میں دلچسپی نہیں لیتے کیوں کہ کام اُن کے لیے کشش نہیں رکھتا۔ اس سے نہ تو انہیں تسکین ملتی ہے نہ ہی وہ ان کے لیے چیلنج بنتا ہے۔ کام کی ان کی نظر میں اس سے زیادہ کوئی وقعت نہیں کہ وہ ہر ہفتے انہیں تنخواہ کا لفافہ وصول کرا دیتا ہے۔ اگر ہمارے دانشور کام کو محض ایک لازمی بدی سمجھیں جس سے مشین کے ذریعے نجات مل سکتی ہے تو پھر اس کو فوری طور پر کم کرنے کی کوشش سے متعجب نہیں ہونا چاہیے۔ ایسی صورت میں تحریک کا مسئلہ لاینحل ہو جائے گا۔

بہرصورت کسی بڑے ادارے کی صحت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ ''اصول تحریک'' کے ساتھ اعلیٰ پیمانے پر انصاف کر سکے۔ کوئی تنظیمی ڈھانچہ، جو کارکنوں میں محنت کی تحریک پیدا کرنے کے اصول کو خاطر میں لائے بغیر استوار کیا جائے گا، وہ اس بنیادی صداقت کی غیر موجودگی میں کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکے گا۔

میرا پانچواں اصول ''اوسط صداقت'' کا اصول ہے۔ کسی بڑے ادارے کی بالائی انتظامیہ ایک مشکل صورتِ حال کا شکار ہوتی ہے۔ پورے ادارے میں جو کچھ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا اس کی تمام تر ذمے داری اُسی پر ہوتی ہے۔ گو انتظامیہ خود ان واقعات سے بہت دور ہوتی ہے۔ یہ ادارے میں ہونے والے مخصوص واقعات سے احکامات، قوانین اور ضابطوں کے ذریعے عہد برآ ہوتی رہتی ہے۔ تاہم نئی صورتِ حال، نئے تخلیقی تصورات، نئی ترقیاتی اختراعات سے انتظامیہ کس طرح نپٹ سکتی ہے؟

ہم نے پہلے کہا ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اہم مسائل ''تنظیم اور آزادی'' کے بنیادی تضاد سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے تضاد کے معنی دو قوانین کے درمیان تضاد کے ہیں۔ دو مختلف محرکات آپس میں ضدین کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے دو اصولوں کے درمیان اختلاف ہوتا ہے جو عقل کے نزدیک مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔

سبحان اللہ! یہی حقیقی زندگی ہے۔ ضدوں سے معمور اور منطق سے ماوراء۔ نظم و ضبط، منصوبہ بندی، پیش گوئی، مرکزی اقتدار، حساب کتاب، کارکنوں کو ہدایات، احکامات کی بجا آوری، تربیت۔۔۔ ان تمام باتوں کے بغیر کوئی کارآمد عمل نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ہر شے بکھر جائے گی۔ تاہم ضابطوں سے اعلیٰ پیمانے کا گریز، پُرمسرت انحراف، ناموجود کی باہمت تلاش، اس کے حصول کی کوشش جو حد و حساب و شمار سے باہر ہو، خطرہ مول لینے کی صلاحیت، تخلیقی متخیلہ کی ان حدود میں پرواز ہاں پَر نہ مار سکے۔۔۔ ان باتوں کے بغیر زندگی مضحکہ خیز اور ذلت آمیز بن جاتی ہے۔

مرکز نظم و ضبط تو برقرار رکھ سکتا ہے مگر آزادی و تخلیق کی ذمے داری مشکل ہے۔ مرکز کے پاس نظم و ضبط قائم کرنے کی قوت ہوتی ہے مگر قوت کی کوئی مقدار تخلیقی اُپج کو پیدا نہیں کر سکتی۔ پھر یوں کیسے ممکن ہے کہ مرکز کی بالائی انتظامیہ ترقی اور اختراع کو بروئے کار لا سکے؟ فرض کیجیے اُسے یہ معلوم ہے کہ کیا کرنا ہے لیکن بالائی انتظامیہ پورے ادارے میں یہ کام کیسے کرا سکتی ہے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں اوسط صداقت کا اصول ضروری ہو جاتا ہے۔

MashalBooks.com

مرکز اس صداقت کو، جو اُس نے دریافت کی ہے، سامے لاسکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے: ''اصل کام یہ ہے جو کرنا چاہیے۔'' وہ ہدایات بھی جاری کرسکتا ہے۔ وہ اصلا مقام کار سے ہمیشہ دور وتا ہے اس لیے اس پر یہ تنقید ہمیشہ ہوسکتی ہے کہ وہ ''صدر دفتر سے کارخانہ چلانے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں مرکز آزادی کی ضرورت کو نظم وضبط کی ضرورت پر قربان کردیتا ہے اور نچلی سطح کے ان کارکنوں کی تخلیقی شمولیت سے بے نیاز ہوجاتا ہے جو اصل کام سے مکمل طور پر وابستہ ہوتے ہیں ایسی صورت میں نہ نصیحتیں کام آتی ہیں نہ بالائی احکامات___ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی چیز ان دونوں کے درمیان ہو۔ اُوپر سے عاید شدہ کوئی حکم جو مکمل طور پر حکم بھی نہ ہو۔

اوسط صداقت کی دریافت خاصی اہم بات ہے۔ پند ونصائح نسبتاً آسان ہیں۔ ہدایات جاری کرنا بھی بہت آسان ہے۔ لیکن بالائی سطح کی انتظامیہ کے لیے یہ کام مشکل ہے کہ وہ نچلی سطح کے کارکنوں کے احساسِ آزادی و ذمہ داری کو ٹھیس پہنچائے بغیر اُن کے ذریعے اپنے تخلیقی تصورات کو بروئے کار لاسکے۔

میں نے ایسے پانچ اصولوں کا ذکر کیا ہے جو میرے خیال میں بڑے پیمانے کے اداروں کے لیے مناسب ہیں۔ میں نے اُن کے عجیب وغریب نام بھی رکھ دیے ہیں۔ ایسی باتوں کا فائدہ کیا ہے؟ کیا یہ محض عقلی کھیل ہے؟ بہت سے قارئین یہی سمجھیں گے مگر جن کے لیے یہ باب تحریر کیا گیا ہے برجستہ پکار اُٹھیں گے: ''بے شک آپ وہی کچھ ضابطہ تحریر میں لا رہے ہیں جس پر میں ایک مدت سے عمل کر رہا ہوں۔'' بالکل ٹھیک۔ کامیاب کوششوں کے لیے کسی نہ کسی نظریے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نظریے بعض اصولوں کی بنیاد پر وضع ہوتے ہیں۔ یہ اصول کہاں سے آتے ہیں؟ اصول مشاہدے اور معاملات کی عملی تفہیم سے پیدا ہوتے ہیں۔

نظریے اور عمل کے ایک دوسرے پر اثرات کے ماؤزے تنگ نے بہترین صورت میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے: ''عملی لوگوں کے پاس جاؤ اور ان سے سیکھو۔ پھر ان کے تجربات کو ملا جلا کر اصولوں اور نظریات میں ڈھالو۔ پھر عملی لوگوں کے پاس واپس جاؤ اور ان سے کہو کہ وہ اب ان اصولوں اور طریق کار پر عمل پیرا ہوں تاکہ وہ اپنے مسائل کو حل کرکے آزادی اور خوشی حاصل کرسکیں۔''

MashalBooks.com

سوشلزم

عملی تجربے اور نظریاتی حوالوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سوشلزم محض اپنی غیر معاشی اقدار اور مذہب معیشت پر فتح کے امکانات ظاہر کرنے کے باعث دلچسپ ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں ''دولت پوجا'' عام ہو، جو کروڑ پتیوں کو کلچرل ہیرو سمجھتا ہو، اشتراکیت سے ایسی کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتا جو وہ کسی اور ذریع سے حاصل نہ کر سکتا ہو۔

لہٰذا یہ بات مطلق عجیب نہیں کہ نام نہاد ترقی یافتہ معاشروں میں بہت سے سوشلسٹ حضرات، جو خود بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر ''مذہب معیشت'' کے پیرو ہیں، آج یہ سوچنے لگے ہیں کہ کہیں قومی ملکیت کا تصور بے معنی تو نہیں ہو گیا۔ اس سے بہت سی مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ پھر اس کے لیے پریشان کیوں ہوا جائے؟ ذاتی ملکیت کا خاتمہ خود بخود اعلیٰ نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ ہر قابل قدر شے کے حصول کے لیے صبر اور یقین کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مالیاتی استحکام کو اگر اعلیٰ معاشرتی مقاصد کے ساتھ نتھی کر دیا جائے تو اس سے بہت سے مشکل مسائل پیدا ہوں گے، بتہیرے تضادات ظاہر ہوں گے اور انتظامیہ فالتو بوجھ کے تلے دب جائے گی۔

اگر قومی ملکیت کا مقصد بنیادی طور پر زیادہ تیز معاشی ترقی، اعلیٰ تر صلاحیت کار، بہتر منصوبہ بندی وغیرہ ہو تو اس سلسلے میں ناکامی یقینی ہے۔ سارے معاشی عمل کو ذاتی ہوس کی بنیاد پر چلانے کے تصور نے، جیسا کہ مارکس نخود تسلیم کیا ہے، ساری دنیا کو تبدیل کرنے میں غیر معمولی قوتوں کا اظہار کیا ہے:

> بورژوا نے جہاں کہیں بھی برتری حاصل کی، تمام جاگیردارانہ، پدری، قبائلی تعلق کو ختم کر دیا اور انسان اور انسان کے درمیان واضح ذاتی اغراض کے علاوہ اور کوئی بندھ باقی نہ رہنے دیا.....
>
> بورژوا نے تمام آلاتِ پیداوار کو تیزی سے بہتر بنا کر اور رسل و رسائل کے نظام کی سہولتوں کو اعلیٰ پیمانے پر فروغ دے کر وحشی اقوام تک کو تمدن میں مدار میں کھینچ لیا۔
>
> (کمیونسٹ مینی فسٹو)

MashalBooks.com

ذاتی ملکیت کے تصور کی قوت اس کی خوفناک سادگی میں ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ پوری زندگی کو محض ایک پہلو پر مرتکز کیا جاسکتا ہے اور وہ ہے نفع۔ تاجر ایک فرد کی حیثیت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ شاید نیکی، صداقت اور حسن میں بھی___ لیکن بطور تاجر اس کا تعلق محض منافع سے ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ذاتی سرمایہ کاری کا تصور ''منڈی'' کے تصور میں کھپ جاتا ہے۔ منڈی کو میں پہلے ''انفرادیت اور غیر ذمہ داری کا ادارہ'' کہہ چکا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی یہ مکمل طور پر مقداریت کے جدید رجحان سے بھی میل کھاتا ہے جو قدری امتیازات کی تحسین کو مطلق درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ سرماہ دار کا تعلق اس شے سے نہیں ہوتا جو وہ پیدا کرتا ہے بلکہ اس منافع س ہوتا ہے جو وہ پیداوار سے حاصل کرتا ہے۔

اگر آپ حقیقت کے ہزاروں پہلوؤں سے صرف نظر کر کے اسے محض ایک پہلو پر مرتکز کر دیں تو ہر شے بالکل واضح ہو جائے گی۔ آپ کو معیلوم ہو جائے گا کہ کیا کرنا ہے۔ وہی جو نفع بخش ہو۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کن باتوں سے پرہیز کرنا ہے نہ ان سے جو کمی پیدا کریں یا نقصان دہ ہوں۔ اور ہاں، آپ کے پاس کامیابی اور ناکامی کو ناپنے کا آلہ بھی موجود ہے۔ اس قسم کے سوالات اٹھا کر مسئلے کو نہ الجھانے دیں مثلاً کیا مخصوص عمل، معاشرے کی خوشحالی کی ضمانت دیتا ہے یا وہ اخلاقی، جمالیاتی، تہذیبی فروغ کا سبب بنتا ہے؟ محض یہ معلوم کریں کہ کیا وہ نفع بخش ہے یا یہ معلوم کریں کیا کوئی اور عمل اس سے زیادہ منافع دے سکتا ہے۔ اگر کوئی متبادل عمل ہو تو اسے اختیار کر لیں۔

یہ محض اتفاق نہیں کہ کامیاب تاجر بسا اوقات انتہائی ''پس ماندہ'' ہوتے ہیں۔ وہ ایسی دنیا میں رہتے ہیں جو کم ہوتے ہوتے پس ماندہ ہوگئی ہے۔ وہ زندگی کے آسان نسخے کے مطابق گزر بسر کرتے ہیں اور اس سے مطمئن ہیں۔ جب اصل زندگی اپنے کسی دوسرے پہلو کو، اس پہلو کو جو ان کے فلسفہ زیست میں شامل نہیں ہے، ان پر واضح کرتی ہے تو وہ لاچار اور پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ خود کو خطرات میں گھرا ہوا دیکھتے ہیں۔ ''نامناسب'' قوتوں کے روبرو وہ عام تباہی کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کے مقصد اور معنی کے متعلق مکمل نقطہ نظر سے پیدا ہونے والے اعمال پر ان کے عاید کردہ فیصلے مطلق بے معنی و کم وقت ہوتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بات طے ہے کہ کوئی اور منصوبہ، مثلاً وہ تجارت جس کی بنیاد ذاتی ملکیت کے تصور پر نہ ہو، بالآخر کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس کے باوجود اگر وہ کامیاب ہو جائے تو اس کے لیے ایک خوفناک

وضاحت اس طرح ہوتی ہے کہ اس میں ''صارفین کا استحصال'' ہے۔ ''جبری محنت'' کا استعمال ہے، ''اجارہ داری'' ہے یا پھر ''نقصان کا کھاتا'' ہے جو آئندہ یک بیک سامنے آجائے گا۔

معاف کیجیے یہ سب باتیں تو اصل نقطے سے گریز ہیں۔ بات یہ ہے کہ ذاتی سرمایہ کاری کے تصور کی قوت اس خوفناک آسانی میں ہے جو ان ذہنی نمونوں کے عین مطابق ہے جنہیں سائنس کی کامیابیوں نے پیدا کیا ہے۔ سائنس کی قوت بھی اس کمی کے رجحان سے مستعار ہے جس کے مطابق حقیقت کے مختلف پہلوؤں سے طرفِ نظر کر کے اسے محض کسی ایک پہلو سے وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر اس کا تعلق اقدار کو مقدار میں تبدیل کر دینے سے ہے۔ تاہم جس طرح انیسویں صدی کا شدید ذہنی ارتکاز حقیقت کے میکانکی پہلو سے محض اس لیے ختم ہو گیا کہ اس میں حقیقت کے اور بہت سے پہلو ضم نہیں ہو سکتے تھے، اسی طرح تجارتی زندگی کا شدید ذہنی ارتکاز، جو اب تک منافع پر تھا اسے بھی ایک نئی صورتِ حال میں ڈھلنا پڑا کیوں کہ وہ انسانی زندگی کی حقیقی ضروریات سے انصاف نہیں کر سکا۔ یہ سوشلسٹوں کا تاریخی کارنامہ ہے کہ انہوں نے اس نئی صورت حال کو پیدا کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج روشن خیال سرمایہ داروں کی زبان پر یہ فقرہ عام ہے کہ ''اب تو ہم سب سوشلسٹ ہیں''۔

اس بات کے معنی یہ ہوئے کہ آج کا سرمایہ دار اس بات سے انکاری ہے کہ اس کے تمام اعمال کا مقصد محض منافع کی فراہمی ہے۔ پرانی قسم کی سرمایہ کاری محض نفع کمانے کے لیے تھی۔ لہٰذا مقاصد واضح تھے اور کامیابی اور ناکامی کے معیار بھی ''نئے طرز'' کی نجی سرمایہ کاری مختلف النوع مقاصد کی حامل ہے۔ اس کی نظر محض پیسہ کمانے پر نہیں بلکہ پوری زندگی پر ہے۔ اس طرح دیکھیے تو ''نئے طرز'' کی نجی سرمایہ کاری مختلف النوع مقاصد کی حامل ہے۔ اس کی نظر محض پیسہ کمانے پر نہیں بلکہ پوری زندگی پر ہے۔ اس طرح دیکھیے تو ''نئے طرز'' کی نجی سرمایہ کاری قومی سرمایہ کاری سے محض ایک بات میں مختلف ہے اور یہ کہ وہ اپنے حصہ داروں کو منافع کی رقم تقسیم کرتی ہے۔

ظاہر ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے حامی دونوں حق نہیں رکھ سکتے۔ ایک طرف یہ کہتے ہوئے کہ ''ہم سب سوشلسٹ ہیں'' دوسری طرف یہ نہیں کہہ سکتے کہ ''سوشلزم کامیاب نہیں ہو سکتا۔'' اگر وہ خود منافع کے علاوہ دیگر مقاصد کے بھی حامی ہیں تو پھر وہ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ منافع کمانے کے علاوہ کوئی دوسری غرض بیچ میں آجائے تو قومی وسائل پیداوار کا مناسب انتظام

ناممکن ہو جائے گا۔ اگر وہ پیسہ کمانے کے فرسود مقصد کے بغیر مناسب انتظام کر سکتے ہیں تو قومی ملکیت کی صنعتیں بھی تو یہ کام کر سکتی ہیں۔

اس کے برعکس اگر یہ سب محض دکھاوا ہے اور نجی سرمایہ کاری نفعے کے علاوہ عملی طور پر اور کچھ نہیں چاہتیں اور اس کی دوسری کارگزاریاں بھی منافع کمانے کی بنیاد پر ہیں اور یہ اس کی اپنی مرضی ہے کہ منافع میں سے کچھ رقم دیگر کاموں پر صرف کرے تو پھر اس عمل کی جلد از جلد وضاحت ہو جانی چاہیے۔ ایسی صورت میں نجی سرمایہ کاری کی قوت کی بنیاد وہی آسانی ہوگی جس کی ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں۔ پھر قومی سرمایہ کاری کے خلاف اس کا دعویٰ یہ ہوگا کہ اس کی خرابی بنیادی طور پر اس بات میں ہے کہ یہ ایک ہی وقت میں بہت سے مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہے اور سوشلسٹوں کا دعویٰ نجی سرمایہ کاری کے خلاف معاشی نوعیت کا ہوگا۔ وہ یہ کہ نجی سرمایہ کاری اپنی سادگی کے باعث زندگی کی تذلیل کرتی ہے۔ وہ اپنے تمام تر معاشی عمل کی بنیاد لالچ کے محرکات پر رکھتی ہے۔

قومی ملکیت کو یکسر مسترد کر دینے کا مطلب نجی ملکیت کی سراسر تائید ہے۔ یہ سا قسم کا ت صعب ہے جیسا کہ اس کے برعکس کمیونسٹوں کا ہے۔ تمام تر تعصب عقل کی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن ایسا تعصب، جو غیر یقینی مقاصد کے حصول کے لیے ''ذرائع کے استعمال'' سے متعلق ہو، وہ واضح ذہنی کمزوری کا حاصل ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ساری معاشی زندگی بلکہ عام زندگی کا جوہر اس بات میں ہے کہ اسے مسلسل ایسے تضادات کے زندگی بخش حلوں کی ضرورت ہوتی ہے جو منطقی پر لا ینحل ہوں۔ منصوبہ بندی اور آزادی کی ہمہ وقت ضرورت ہوتی ہے۔ محض بندی اور آزادی کی ہمہ وقت ضرورتی ہوتی ہے۔ محض کمزور سمجھوتے کی صورت میں نہیں بلکہ دونوں کی بیک وقت ضرورت کو لازمی سمجھتے ہوئے۔ معیشت کی بھی یہی صورت ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں انتظامیہ کے اختیارات کی برتر یہ ہو اور یہ بھی کہ اس میں آزاد اور جمہوری شمولیت کارکنوں کی ہو۔ یہ تضاد بے دلی سے حل نہیں کرنا چاہیے کہ جانبین میں سے کسی کی بھی تسکین نہ ہو۔ اس کا حل دونوں ضرورتوں کو تسلیم کر کے ہی ممکن ہے۔

اگر اس تضاد میں سے ایک پر ہی زور دیا جائے مثلاً منصوبہ بندی پر تو حاصل ''سٹالنیت'' ہوگا۔ جب کہ محض دوسرے پر زور کا نتیجہ انتظار ہوگا۔ لہٰذا ایک درمیانی راہ کی ضرورت ہے جو

دانشمندی سے حاصل ہوسکتی ہے، کم از کم کچھ مدت کے لیے، جس میں تضاد کو حل کیا جاسکتا ہے۔

نجی سرمایہ کاری (قدیم طرز) کو ضرورت سادگی اور آسان پیمائش کی ہے جو نقطہ نظر کو محدود کر کے نجی منافع پر مرکوز کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس قومی سرمایہ کاری ہے جس کی ضرورت وسیع تر انسانی تصور ہے جو معاشی عمل کے لیے پس منظر بنتا ہے۔ اگر محض اول الذکر پر عمل پیرا ہوا جائے تو یہ عمل حرمت انسانی کی مکمل تذلیل اور بربادی کا باعث ہوگا جب کہ دوسری بالآخر صلاحیت کار کی بربادی اور انتشار کا باعث ہوگی۔

اس قسم ے مسائل کا کوئی آخری حل نہیں ہوتا۔ صرف زندگی بخش حل ہوتا ہے جسے یہ مان کر دونوں اپنی اپنی جگہ مسلم ہیں۔ روز بروز حاصل کیا جاسکتا ہے۔

ملکیت خواہ نجی ہو یا قومی محض ایک نظا کار مہیا کرتی ہے۔ یہ بطور خود یہ طے نہیں کرتی کہ اس نظام کار کے حوالے سے کن مقاصد کو حاصل کرنا ہے۔ اس نقطہ نظر سے یہ کہنا صحیح ہے کہ محض ملکیت ہی فیصلہ کن سوال نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ذرائع ضد یا وار کی نجی ملکیت مقاصد کے انتخاب کو سلسلے میں سختی سے محدود ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ منافع حاصل کرن پر مجبور اور تنگ نظری اور خود غرضی کا شکار ہوتی ے۔ اس کے برعکس قومی ملکیت اغراض و مقاصد کے انتخاب میں آزادتی ہوتی ہے اس لیے ہر مقصد کے لیے استعمال ہوسکتی ہے۔ نجی ملکیت میں ان مقاصد کا پہلے سے تعین ہوتا ہے جن کے لیے اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ قومی ملکیت میں مقاصد پہلے سے متعین نہیں ہوتے۔ انہیں شعوری طور پر منتخب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

لہٰذا ایسی صورت میں قومی ملکیت کا دعویٰ کمزور ہو جائیگا۔ اگر قومیائے گئے ادارے بھی انہی حدود اور تنگ نظری کا شکار ہو جائیں جن کے شکار بہ اعتبار مقاصد سرمایہ دارانہ پیداوی ادارے ہیں یعنی محض منافع اور بس____

قومی ملکیت کے دشمن اس کے خلاف دو باتوں کے حوالے سے تحریک چلاتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ عوام کو نیز ان لوگوں کو جو پبلک سیکٹر میں کام کر رہے ہیں یہ یقین دلانا چاہتے ہیں یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ذرائع پیداوار کے نظم و نسق میں اہم ترین چیز منافع ہے۔ اس ''پاک معیار'' سے ہٹنا بالخصوص قومی ملکیت میں، ہر شخص کے لیے بوجھ بن جاتا ہے اور پوری معیشت میں اگر کہیں کوئی خرابی ہوگی تو اس کی ذمہ داری براہ راست اس پر ہوگی۔ یہ تحریک بڑی حد تک کامیاب ہے۔ دوسری بات یہ جتلانا ہے کہ قومی ملکیت کے شعبوں میں کوئی خاص بات ایسی

نہیں جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ بہتر معاشرتی زندگی کے لیے کوئی اقدام کر سکتے ہیں۔ لہٰذا قومی ملکیت کے فروغ کے لیے کوئی آئندہ اقدام محض تعصب کی دلیل ہوگا۔ یہ محض ایسی چھین جھپٹ ہے جسے ناکام سیاستدانوں نے روا رکھا ہے۔ استحریک کے اثرات بھی سوشلسٹ فکر پر پڑے ہیں۔

بنیادی سوشلسٹ فکر کی خامی یا قومی ملکیت میں شامل صنعتوں کے نظم و نسق میں خرابی اس مخالف تحریک کی ذمہ دار نہیں۔ اس قسم کے الزامات مطلق بے بنیاد ہیں۔ البتہ سوشلسٹ دانشوروں میں بصیرت کی کمی ضرور واقع ہوئی ہے۔ جب تک وہ اپنی بصیرت کو بروئے کار نہیں لائیں گے ساوقت تک نہ وہ تازہ دم ہو سکتے ہیں اور نہ قومی ملکیت صحیح طور پر اپنا کام کر سکتی ہے۔

وہ معیشت نہیں تہذیب ہے جسے خطرہ لاحق ہوا ہے۔ معیار زندگی نہیں زندگی کی اعلیٰ اقدار ہیں۔ معیشت اور معیار زندگی کے تقاضے تو سرمایہ دارانہ نظام بھی پورے کر سکتا ہے۔ اور سرمایہ دارانہ نظام میں تھوڑی بہت ترمیم کر کے اسے معتدل بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن تہذیب اور اقدارِ حیات ایسے نظامِ حیات میں ہمیشہ مائل بہ زوال رہیں گی۔

سوشلسٹوں کو چاہیے کہ وہ قومی صنعتوں کو محض رمایہ داروں سے مقابلے کے لیے استعمال نہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوں۔ صنعتی نظم و نسق کا ایک بہتر نظام ترتیب دینے کی رضورت ہے۔ مشینوں کے انسانی نقطہ نظر سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ اور انسانی قوت اختراع اور کوشش و کاوش سے اصل شدہ ثمرات کو دانشمندانہ انداز میں استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ سوشلسٹ دانشور یہ کر سکیں تو مستقبل انہی کے ہاتھوں میں ہوگا۔ اور اگر نہ کر سکیں تو پھر ان کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جو آزاد انسان کے پسینے کے قابل ہو۔

MashalBooks.com

ملکیت

''یہ واضح حقیقت ہے کہ نظام یا مشین کی کسی تبدیلی سے معاشرتی بیماریوں کے وہ اسباب دور نہیں ہو سکتے جو انسانی فطرت کی انانیت، حرص اور لڑاکو پن میں مضمر ہیں۔ محض یہ ہو سکتا ہے کہ ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس میں ان صلاحیتوں کے فروغ کی گنجائش نہ ہو۔ اس کی ضمانت تو نہیں دی جا سکتی کہ لوگ اصولوں کے مطابق زندگی بسر کریں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایسا معاشرتی نظام ترتیب دیا جائے جس کی بنیاد اصولوں پ ر ہو جس کے مطابق اگر وہ چاہیں تو زندگی بسر کریں تاہم اسے ختم نہ کر سکیں۔ ان کے اعمال کو کنٹرول نہیں کیا جا سکتا البتہ ان کے سامنے وہ مقاصد رکھے جا سکتے ہیں جن پر وہ اپنے ذہنوں کو مرکوز کر سکیں۔ جیسے ان کے ذہن ہوں گے انہی کے مطابق ایک طویل مدت میں، منشیات کو چھوڑ ر، ان کے عملی اقدام بھی ہوں گے۔''

یہ الفاظ آ۔ ایچ۔ ٹانی کے ہیں جو کافی دہائیاں پہلے لکھے گئے۔ البتہ اب حالات ایسے ہیں کہ محض معاشرتی بیماریاں ہی نہیں بلکہ پوری انسانی نسل کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ پچھلے ابواب میں ہم نے جن مسائل پر بحث کی ہے ان کا تعلق نظام کار سے ہے یا مشین سے۔ تاہم کوئی نظام یا مشین یا معاشی نظرہ خود اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوتا۔ اس کی بنیاد مابعد اطبیعیاتی ہوتی ہے یعنی زندگی کے متعلق آدمی کے بنیادی نقطہ نظر پر میں نے مذہب معیشت کی بات کی ہے، مادی اشیا کی پوجا اور نام نہاد معیار زندگی کی اور اس تصور کی جو اس بات میں فرحت محسوس کرتا ہے کہ ''ہمارے اجداد کے لیے جو سامانِ تعیش تھا وہ ہمارے لیے ضرورت بن گیا ہے۔''

نظام کم و بیش انسانوں کے بنیادی رویوں کی تجسیم ہوتے ہیں۔ آج کی نجی سرمایہ کاری کا نظام ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے کامل ترین آلۂ کار ہے۔ یہ انسانی حرص اور شک کے جذبات کو بطور محرک استعمال کرتا ہے۔ البتہ آزاد تجارت کے پرانے نظریے میں کینز کے تصورات کے مطابق تھوڑی بہت ترمیم کر لیتا ہے۔

کیا ایسا نظام ان مسائل سے دو چار ہو سکتا ہے جو آج ہمیں درپیش ہیں؟ جواب واضح ہے۔ حرص اور رشک کا تقاضا یہ ہے کہ مادی قسم کی لامحدود معاشی ترقی ہوتی ہے۔ ایسی ترقی محدود ماحول سے مطابقت نہیں رکھتے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ نجی سرمایہ کاری کے نظام کی

ماہیت کا مطالعہ کر کے ایسے متبادل نظام کو مرتب کرنے کے امکانات پر غور کیا جائے جو نئے تقاضوں کے مطابق ہو۔

نجی سرمایہ کاری کا بنیادی عنصر ذرائع پیداوار نیز تقسیم اور لین دین کے ذرائع کی نجی ملکیت ہے۔ یہی سبب ہے کہ نجی سرمایہ کاری پر تنقید کرنے والے بالعموم نجی ملکیت کو قومی ملکیت بنانے پر زور دیتے ہیں۔ آیئے ملکیت کے تصور پر غور کریں۔

جہاں تک نجی ملکیت کا تعلق ہے اس میں پہلی اور بنیادی امتیازی صفت یوں قائم کرنی چاہیے:

(۱) وہ ملکیت جو تخلیقی کاموں میں معاون ثابت ہو۔

(۲) ملکیت جو تخلیقی کاموں کی متبادل ہو۔ اول الذکر فطری اور صحت مند تصور کی حامل ہے یعنی وہ ملکیت جو کام کرنے والے شخص کی ہو۔ ثانی الذکر اس کے برعکس غیر فطری اور غیر صحت مند تصور رکھتی ہے۔ یعنی ایسی ملکیت جو کسی ایسے شخص کی ہو جو دوسروں کے کام سے فائدہ اٹھاتا ہو۔

پہلی قسم کی نجی ملکیت محدود پیمانے کی، ذاتی اور مقامی ہوتی ہے۔ اس کی بڑے پیمانے کی معاشرتی ذمے داریاں نہیں ہوتیاں۔ اس کی جو ذمہ داریاں صارفین پر ہیں ان کی نگرانی خود صارفین کر سکتے ہیں۔ معاشرتی قوانین اور ٹریڈ یونین کارکنوں کا تحفظ کر سکتی ہے۔ گو چھوٹے پیمانے کی سرمایہ کاری سے بڑے پیمانے پر دولت اکٹھی نہیں کی جا سکتی مگر اس کے معاشرتی فوائد بہت زیادہ ہیں۔

جب ہم چھوٹے پیمانے کی سرمایہ کاری سے اوسط درجے میں قدم رکھتے ہیں تو ملکیت اور کام میں تفاوت بڑھ جاتا ہے۔ نجی سرمایہ کاری غیر ذاتی بن جاتی ہے اور مقامی صورت حال میں ایک اہم معاشرتی عنصر ___ اس کی اہمیت مقامی سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ بتدریج نجی ملکیت کا تصور غلط فہمی پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے۔

۱۔ مالک کو، جو تنخواہ دار منتظمین رکھ لیتا ہے، اس بات کی ضرورت نہیں رہتی کہ وہ پروپرائٹر بن کر خود کام کرے لہٰذا عملی طور پر اس کی ملکیت کی غیر ضروری ہو جاتی ہے۔ جب وہ اپنی خاطر خواہ تنخواہ سے زائد رقم خود ہضم کرنے لگتا ہے تو ملکیت استحصال بن جاتی ہے۔

۲۔ کثیر منافع یا تو محض اتفاقی ہوتا ہے یا پھر پوری صنعت کی کارکردگی کے سبب۔ مالک کا

اس سے سروکار نہیں ہوتا لہٰذا مالک اسے خود رکھ لے تو یہ سراسر غیر منصفانہ اور معاشرتی بدعنوانی کا حامل ہے۔ اسے تنظیم کے سارے ارکان میں تقسیم ہونا چاہیے۔

۳۔ ایسی اوسط صنعت، جس میں تعلقات غیر ذاتی ہو جائیں، نظم و نسق کے مسایل پیدا کرتی ہے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعت میں مطلق العنان اقتدار بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا۔ اس صورت میں کام میں شریک مالک کے ساتھ کارکنوں کی حیثیت ایک خاندان کی سی ہوتی ہے۔ بڑے پیمانے کی صنعتوں میں ایسے نظام کار کی ضرورت شدید ہو جاتی ہے جس میں سارے کارکنوں کو انتظامی مسائل میں شرکت کا موقع ملے۔

۴۔ کسی فرم کی معاشرتی اہمیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس میں ایک قسم کی ''قومی ملکیت'' نافذ کی جائے جو فرم کے ارکاین سے ماوراء ہو۔ یہ ''قومی ملکیت'' اس طرح قائم ہوسکتی ہے کہ اس فرم کے منافع کا کچھ حصہ مستقل طور پر فلاحی مقاصد کے لیے علیحدہ کیا جاتا رہے اور اس کام کو چلانے کے لیے باہر سے ٹرسٹی مقرر کیے جائیں۔

سرمایہ دار ممالک میں اس قسم کی کارکردگی سے نجی سرمایہ کاری کی بدعنوانیوں کو بڑی حد تک ختم کر دیا گیا ہے۔

جہاں تک بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری کا تعلق ہے اس میں نجی ملکیت کا تصور مضحکہ خیز ہے۔ ملکیت کسی حقیقی مفہوم میں نجی ہو ہی نہیں سکتی۔ بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری کا تعلق ہے اس میں نجی ملکیت کا تضو مضحکہ خیز ہے۔ ملکیت کسی حقیقی مفہوم میں نجی ہو نہیں سکتی۔ بڑے پیمانے کی نجی ملکیت چھوٹے موٹے زمینداروں، ہنرمندوں اور سرمایہ کاروں کی ملکیت کے مماثل نہیں رہ جاتی۔ بقول ٹانی یہ ''ان جاگیردارانہ محصولوں کی طرح ہے جو فرانسیسی کسانوں کی پیداوار کے ایک حصہ کو زبردستی چھین لیتے تھے یہاں تک کہ انقلاب نے ان کا خاتمہ کر دیا۔''

مختصراً یہ کہ:

۱۔ چھوٹی سرمایہ کاری میں نجی ملکیت فطری، ثمر اور مبنی بر انصاف ہوتی ہے۔

۲۔ اوسط سرمایہ کاری میں نجی ملکیت بڑی حد تک عملی طور پر غیر ضروری ہو جاتی ہے۔ ملکیت کا تصور غیر فطری، فضول اور غیر منصفانہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری میں نجی ملکیت کا تصور بے معنی ہے۔ یہ محض غیر منصفانہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا غیر منطقی عنصر ہے جو پوری صنعت میں تمام تر تعلقات کو مسخ

MashalBooks.com

کر دیتا ہے۔ بڑے پیمانے کی نجی ملکیت کو ختم کرنے کے بہت سے طریقے ہیں جن میں سب سے زیادہ معروف ''قومی ملکیت'' کا طریقہ ہے۔

انگلستان میں بہت سی صنعتوں کو قومی تحویل میں لیا گیا۔ انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ کسی صنعت کی خوبی ان لوگوں کی وجہ سے ہوتی ہے جو اسے چلاتے ہیں، غیر حاضر مالکان کے سبب نہیں۔ اس کے باوجود ان کے خلاف انتھک پروپیگنڈا ان لوگوں کو بھی گمراہ کر رہا ہے جو اس سے نفرت نہیں کرتے اور حالات کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔

ملکیت محض ایک حق نہیں یہ مختلف حقوق کا بنڈل ہوتا ہے۔ قومی ملکیت صرف یہ نہیں کہ اس بنڈل کو ایک شخص سے لے کر دوسرے کو سپرد کر دیا جائے۔ یہ غور و فکر کے بعد انتخاب کا مسئلہ ہے کہ حقوق کے سب بنڈل کو کہاں رکھا جائے۔ یہ بنڈل سارے کے سارے، قومی ملکیت کے تصور سے پہلے نجی ملکیت میں تھے۔ ٹانی کے بقول: ''قومی ملکیت کی تحویل آئین سازی کا مسئلہ ہے۔'' ایک بار جب نجی ملکیت کا قانونی حق ختم ہو گیا تو پھر اس بات کی آزادی ہے کہ چیزوں کو نئے سرے سے ترتیب دیا جائے: خواہ مدغم کیا جائے، خول توڑ دیا جائے، خواہ مرکزیت قائم کی جائے، خواہ لامرکزیت۔ بڑے یونٹ قائم کیے جائیں یا چھوٹے یونٹ، متحدہ نظام یا وفاقی نظام یا کوئی نظام نہیں۔ نئے انتظامات ہر مخصوص صورت حال کے مطابق ہونے چاہییں۔ تاہم قومی سرمایہ کاری کی ہر صورت میں بعض اصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے:۔

(۱) تجارت اور سیاست کو آپس میں ضم کرنا خطرناک ہے۔ ایسی صورت میں ناکارہ تجارت اور بدنما سیاست پیدا ہوتی ہے۔ قومی ملکیت کے قانون میں ان حقوق کی نشاندہی ہونی چاہیے جو سیاسی حکام یا ان کے نمائندے استعمال کر سکتے ہوں۔

(۲) قومی سرمایہ کاری، جو عوام کی فلاح کے لیے ہو، اس کے پیش نظر محض ایک نفع ہو جو زندہ رہنے کے لیے کھانے کے مطابق ہو نہ کہ کھانے کے لیے زندہ رہنے کی خاطر، نیز اسے مالیات کو فروغ دینا چاہیے۔ اسے منافع کی رقم تقسیم نہیں کرنی چاہیے، حکومت کو بھی نہیں۔ زیادہ منافع کو قیمتوں میں کمی کر کے کم کر دینا چاہیے۔

(۳) قومی ملکیت کا یہ مستقل فریضہ ہونا چاہیے کہ ہر صورت میں عوام کی فلاح سوچے۔ عوام کی فلاح کس بات میں ہے، اسے طے کرنا صنعت کا کام ہے۔ یہ نہایت فضول بات ہے کہ یہ دعویٰ کیا جائے کہ قومی ملکیت کو محض منافع سے سروکار رکھنا چاہیے۔ وہ نجی حصہ داروں

کے لیے کام کر رہی ہو۔ قومی فلاح کی تعریف کو حکومت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ہر پہلو سے عوامی فلاح کا کام کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ بات صنعتی انتظامیہ کے روزمرہ کے برتاؤ میں شامل ہو جائے۔ اسے باہر سے کنٹرول نہیں کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں اغراض، یعنی منافع کمانے اور عوامی فلاح میں کوئی تضاد پیدا ہو جائے۔ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ قومی صنعت کو چلانا نجی صنعت کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے اور اس کے تقاضے زیادہ بلند ہیں۔

(۴) ایسے انتظامات کا ہونا بھی ضروری ہے جن کا مطابق تمام جائز مفادات پورے کیے جاسکیں مثلاً کارکنوں کے مفادات، مقامی باشندوں کے مفادات، صارفین کے مفادات اور اگر کسی قومی صنعت کے مقابلہ ہو تو اس کے مفادات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس اصول کو مؤثر طور پر نافذ کرنے کے لیے اب بھی بہت سے تجربوں کی ضرورت ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ انظامیہ کی صلاحیت کار کو برقرار رکھتے ہوئے ان مفادات کو کس طرح تحفظ دیا جائے۔

سب سے آخر میں یہ کہ قومی تحویل کو سب سے بڑا خطرہ منصوبہ ساز کی جانب سے مرکزیت پر بے جا زور سے ہوتا ہے۔ قومی تحویل کے ذریعے بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری کو فروغ دینے کی نسبت بالعموم چھوٹی سرمایہ کاریاں بہتر ہوتی ہیں۔ اب تکمیلی طور پر یہی ہوتا رہا ہے۔ دوبارہ تقسیم کار کے ذریعے ذمے داریوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹا جاتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ پہلے ہی نیم خودمختار چھوٹے یونٹ قائم کیے جائیں اور پھر بعض فرائض کو بالائی سطحوں پر مرکوز کر دیا جائے بشرطیکہ داخلی طور پر اعانت اور تعاون کی ضرورت کا شدید کا احساس موجود ہو۔

MashalBooks.com

ملکیت کے نمونے

جے۔ کے۔ گیلبرائیتھ نے نجی خوشحالی اور عوامی بدحالی کی بات کی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے یہ بات امریکہ کی بابت کی ہے جسے عام طور پر دنیا کا امیر ترین ملک سمجھا جاتا ہے۔ بھلا امیر ترین ملک میں عوام بدحال کیسے ہو سکتے ہیں؟ اگر امریکہ کی سطح کی معاشی ترقی عوامی بدحالی کو ختم نہیں کر سکی تو یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ آئندہ کی ترقی اسے ختم یا کم کر سکتی ہے؟ اگر امریکہ کی مجموعی قومی پیداوار میں پانچ فیصد اضافہ ہو جائے تو کیا یہ اضافہ قومی مفادات کے حصول کے لیے خرچ ہو گا؟

یقیناً نہیں۔ اس لیے کہ نجی ملکیت میں منافع کی ہر رقم ہمیشہ نجی ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔ حکومت کی اپنی آمدنی تو کوئی ہوتی نہیں۔ وہ صرف شہریوں کی جیب سے رقم کھینچتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ٹیکس جمع کرنے والوں اور شہریوں کے درمیان ایک مستقل ذہنی جنگ شروع ہو جاتی ہے جس میں امیر شہری ٹیکس قوانین کے ماہرین کی مدد سے غریبوں کے مقابلے میں بہتر فوائد حاصل کرتے ہیں۔ ٹیکس کے قوانین زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں اور اسی تناسب سے ماہرین کی آمدنی بڑھتی جاتی ہے۔ ٹیکس ادا کرنے والے یہی نہیں کرتے کہ قانون کی مدد سے ٹیکس سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ (غیر قانونی عدم ادائیگی کا تو ذکر ہی نہیں) وہ یہ شور بھی مچاتے ہیں کہ عوامی اخراجات کو کم کیا جائے ''زیادہ ٹیکس زیادہ عوامی اخراجات کے لیے'' کے نعرے سے ووٹ نہیں مل سکتے خواہ نجی خوش حالی اور عوامی بدحالی میں کتنا ہی نمایاں فرق کیوں نہ ہو۔

اس مشکل کا حل تب تک ممکن نہیں جب تک کہ وسائل پیداوار کی ملکیت کے ڈھانچے میں عوامی اخراجات کی ضرورت کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ بدحالی کا مسئلہ صرف چند عوامی اداروں مثلاً پاگل خانوں، جیل خانوں اور دیگر ایسے معاشرتی اداروں سے منسلک نہیں جو ہر حکومت کے انتظام وانصرام میں ہوتے ہیں۔ یہ تو مسئلے کا منفی پہلو ہے۔ مثبت پہلو وہاں ابھرتا ہے جہاں پبلک فنڈ کی خطیر رقوم معاشرت کے بالائی ڈھانچے یا انفراسٹرکچر پر صرف ہوتی رہی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ ان سے حاصل شدہ نجی شعبے کو براہ راست اور بلا کسی عوضانے کے پہنچتے ہیں۔ یہ بات اس شخص پر بخوبی واضح ہے جو کسی ایسے غریب معاشرے میں تجارت شروع کرتا ہے جہاں یہ بالائی ڈھانچہ

ناکافی ہے یا وجود ہی نہیں رکھتا۔ وہاں اسے نہ تو رسل ورسائل کو سستے ذریعے حاصل ہوتے ہیں اور نہ دوسری اقسام کی معاونت۔ اسے اپنے خرچ پر وہ تمام چیزیں حاصل کرنی پڑتی ہیں جو وہ بلاخرچ یا کم داموں میں ایسی معاشرت میں حاصل کرسکتا ہے جس کا انفراسٹرکچر زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اسے اپنی ضرورت کے مطابق تربیت یافتہ اشخاص نہیں مل سکتے۔ ان کی تربیت کا بندوبست اسے خود کرنا پڑے گا۔ کسی معاشرے کو تمام تعلیمی، طبی اور تحقیقی ادارے، وہ معاشرہ غریب ہو یا امیر، نجی سرمایہ کاری کو لاتعداد فوائد پہنچاتے ہیں۔ وہ فوائد جن کے لیے نجی سرمایہ کاری براہ راست اخراجات و برداشت نہیں کرتی وہ صرف ٹیکسوں کے ذریعے بالواسطہ طور پر ادائیگی کرتی ہے۔ ٹیکسوں کے ذریعے بالواسطہ طور پر ادائیگی کرتی ہے۔ ٹیکسوں کے بارے میں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کافی ہچکچاہٹ، ناراضگی، نہ دینے کے حیلے بہانے بنائے جاتے ہیں۔ یہ کہنا بالکل بے معنی اور غیر منطقی ہے کہ ان فوائد کے اخراجات جو نجی شعبے کو انفراسٹرکچر سے پہنچتے ہیں، حکومت ان کے منافع سے راہ راست نہیں لے سکتی، صرف تبھی لے سکتی ہے جب وہ اپنا نفع اپنی جیب میں ڈال چکے ہوں۔ نجی سرمایہ کاری یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ اپنا نفع اپنی نجی کوششوں سے حاصل کرتی ہے اور حکومت اس کے منافع کا بڑا حصہ بطور ٹیکس لے لیتی ہے۔ سچی بات بالکل برعکس ہے کہ نجی شعبے کے اخراجات کا ایک بڑا حصہ عوامی فنڈ سے ادا ہوتا ہے کیوں کہ اس فنڈ سے انفراسٹرکچر کے اخراجات ادا ہوتے ہیں۔ ساری صورت حال کا صحیح اندازہ محض تبھی لگایا جاسکتا ہے جب ہم نجی شعبے کے منافع میں عوام اخراجات کی معاونت کا اندازہ لگالیں۔

اب میں اس بات کی ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ عوامی فلاح کے حق میں نجی ملکیت کا ڈھانچہ کس طرح تبدیل کیا جاسکتا ہے:

سکاٹ بیڈر دولت مشترکہ

۲۹۱۰ء میں تیس سال کی عمر میں ارنسٹ بیڈر نے سکاٹ لینڈ کمپنی لمیٹڈ قائم کی۔ اکتیس برس بعد وہ ایک متوسط درجے کی کمپنی کا مالک تھا جس کے مال کی فروخت کی مالیت چھ لاکھ پچیس ہزار پونڈ سالانہ اور منافع بہتر ہزار پونڈ تھا۔ کمپنی کے ملازمین کی تعداد ایک سو اکسٹھ تھی۔ چونکہ اس کی ابتدا صفر سے ہوئی تھی اس تجارت میں وہ اور اس کا خاندان خاصا خوشحال ہوگیا۔ جوانی، میں جب وہ خود ملازم تھا، وہ ''محنت کشوں کی مارکیٹ'' اور ''تنخواہوں کے نظام'' اور بالخصوص اس تصور سے نفرت کرتا تھا کہ سرمایہ انسانوں سے کام لے بجائے اس کہ انسان سرمایے سے کام لیں۔ اب وہ

خود ایک کمپنی کا مالک تھا لیکن وہ یہ بات کبھی نہیں بھلا سکا کہ اس کی کامیابیاں اس کی ذاتی کوشش کا نتیجہ نہیں تھیں۔ ان میں اس کے تمام ساتھی شامل تھے اور یقیناً وہ معاشرہ بھی شریک تھا جس میں وہ عمل پیرا تھا۔ لہٰذا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ کمپنی میں ایسی انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں جن کی بنیاد ''اس فلسفے پر ہو جو صنعت کو انسانی ضروریات کے مطابق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''

مسٹر بیڈر نے یہ بات جان لی تھی کہ دو باتوں کے بغیر فیصلہ کن تبدیلیاں ناممکن ہوں گی۔ اوّل: ملکیت کی قلب ماہیت۔ اس لیے کہ صرف منافع کی تقسیم، جسے انہوں نے پہلے دن سے رائج کر رکھا تھا، کافی نہیں تھی۔ دوم: خود پر لاگو ہونے والے بعض امتناعی ضابطے۔ اول الذکر کے حصول کے لیے انہوں نے سکاٹ بیڈر دولت مشترکہ قائم کی جسے انہوں نے اپنی کمپنی کی ملکیت بخش دی، ثانی الذکر کے لیے انہوں نے اپنے شرکاء (سابق ملازمین) کے تعاون سے ایک ایسا آئین تیار کیا جس کے ذریعے حقوق کی تعریف ہی نہیں کی بلکہ کمپنی کی آزادیِ عمل پر کچھ پابندیاں بھی لگائیں گئیں:

۱۔ کمپنی ہمیشہ ایک خاص حد کے اندر رہے گی تاکہ اُس کے وابستگن اُسے اپنے ذہن و تخیل میں ہمیشہ سموئے رکھیں۔ اس کے کارکنوں کی تعداد کم و بیش تین سو پچاس ہوگی۔ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ اسے پھیلانا ناگزیر ہو تو ایسی صورت میں چھوٹے چھوٹے آزاد یونٹ قائم کیے جائیں گے جو سکاٹ بیڈر دولت مشترکہ کے نمونے پر کام کریں گے۔

۲۔ کمپنی میں کام کا معاوضہ کم تنخواہ اور زیادہ تنخواہ پانے والوں کے درمیان ایک اور سات کے تناسب کے مطابق رہے گا۔ اس میں عمر، صنف، کام اور تجربے کی بنا پر کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

۳۔ تمام کارکن حصہ دار ہیں لہٰذا کوئی کارکن کوئی دوسرا کارکن کو ذاتی بدعنوانی کے جرم کے بغیر نہیں نکال سکے گا۔ البتہ وہ خود باقاعدہ پیشگی اطلاع دے کر کام چھوڑ سکتے ہیں۔

۴۔ کمپنی کے بورڈ کے ڈائریکٹران پوری دولت مشترکہ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ آئین کے مطابق دولت مشترکہ ڈائریکٹروں کی تقرری اور برخاستگی نیز ان کی تنخواہ کے تعین کی مجاز ہوگی۔

۵۔ دولت مشترکہ فرم کے منافع کا محض چالیس فیصد خود رکھ سکے گی۔ کم از کم ساٹھ فیصد ٹیکسوں اور فرم کے دائرے کے اندر سرمایہ کاری کے لیے مختص ہوگا۔ منافع کی رقم کے چالیس فیصد کا آدھا فرم کے کارکنوں میں بونس کے طور پر تقسیم ہوگا اور بقیہ آدھا فرم کے باہر فلاحی کاموں

پر خرچ ہوگا۔

۶۔سب سے آخر میں یہ سکاٹ بیڈر لمیٹڈ کمپنی کا کوئی مال ایسے خریداروں کو نہیں بیچا جائے گا جن کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ اُسے جنگ سے متعلق کاموں کے لیے استعمال کریں گے۔

جب فرم میں ایسی انقلابی تبدیلیاں لائی گئیں تو عام خیال یہ تھا کہ یہ تجربہ ناکام ہوگا لیکن ہوا اس کے برعکس۔انتہائی مقابلے کی فضا میں کام کرتے ہوئے فرم نے ۱۵۹۱ء اور ۱۷۹۱ء کے درمیان پیداوار کی فروخت کی مالیت چھ لاکھ پچیس ہزار سے بڑھا کر پچاس لاکھ پونڈ کر لی اور منافع کی رقم بہتر ہزار پونڈ سے بڑھ کر تین لاکھ پونڈ سالانہ ہوگئی۔ملازمین کی تعداد ایک سو اکسٹھ سے بڑھ کر تین سو اُناسی ہوگئی۔بیس برسوں میں ایک لاکھ پچاس ہزار پونڈ کی رقم بطور بونس تقسیم ہوئی۔اُتنی ہی رقم فلاحی کاموں پر خرچ ہوئی۔علاوہ ازیں کئی چھوٹی چھوٹی فرمیں اور بنائی گئیں۔

بیڈر کا بنایا ہوا یہ نظام صنعت کو انسان کا خدمت گزار بنا دیتا ہے حالانکہ معمول یہ ہے کہ صنعت انسانوں کو استعمال کر کے مالک کے سرمائے میں اضافہ کرتی رہتی ہے۔اس نئے تجربے کے بارے میں بیڈر سے سنیے:

> ''منافع کی شراکت، ساجھے کی حصہ داری یا ملکیت یا کوئی ایسی سکیم جس میں افراد مشترکہ تجارت میں ضمنی مفادر کھتے ہوں، کی فطری ترقی کی ایک صورت میں مشترک ملکیت یا دولت مشترکہ ہے۔اس صورت میں ملکیت کا حق مشترک ہوگا اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے مشترک ملکیت کے فوائد عجیب وغریب ہیں۔''

کسی شخص یا خاندان سے حق ملکیت اگر کسی اجتماع کو مل جائے، جیسا کہ مندرجہ بالا صورت میں ہوا، تو یہ ''ملکیت'' کے کردار کی ایسی تبدیلی ہے جسے ہمیں ''اجتماعی ملکیت'' کہنے کے بجائے، ''نجی ملکیت کا مکمل خاتمہ'' کہنا چاہیے۔مالکین کی تداد میں ایسی مقداری تبدیلی ملکیت کے مفہوم میں قدری تبدیلی کا باعث بنتی ہے بالخصوص اس صورت میں جب کہ ملکیت مشترکہ ہو اور دولت مشترکہ کے اراکین کے انفرادی حقوق کا مطلق تعین نہ ہوا ہو۔یہاں ملکیت کے حق کی جگہ انتظامی امور کے حقوق اور ذمہ داریوں نے لے لی ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کسی کوئی جائداد نہیں ملی اس کے باوجود بیڈر اور ان کے خاندان

نے خود کو اپنی جائداد سے محروم کرلیا۔انہوں نے خود ح سے زیادہ دولتمند ہونے کا موقع گنوا دیا۔ دولت اور آمدنی کی تھوڑی بہت کمی بیشی فطری بات ہے لیکن بیحد دولت بھی اقتدار ہی کی طرح بدعنوانی کا سب ہوتی ہے۔ اگر دولت مند''ناکارہ دولت مند'' نہ بھی ہوں، اگر وہ نہایت محنتی وہس تو بھی ان کا طریق کار مختلف ہوتا ہے، ان کا معیار مختلف ہوتا ہے اور وہ خود بھی عام انسانیت سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ خود کو حریصانہ عمل سے بدعنوان بن لیتے ہیں اور دوسروں میں رشک پیدا کر کے انہیں بدعنوان بنا دیتے ہیں۔

یہ تجربہ واضح کرتا ہے کہ ملکیت کی تبدیلی ضروری ہے لیکن محض یہ کافی نہیں ہے۔ اعلیٰ مقاصد محض اسی طور سے حاصل نہیں کیے جا سکتے لہٰذا ''دولت مشترکہ'' نے خود کو محض منافع کمانے تک محدود نہیں رکھا، اس نے مندرجہ ذیل چار کاموں کو پیش نظر رکھا جن میں سے ہر ایک اہمیت حامل ہے:

۱۔ معاشی عمل: ایسے آرڈر وصول کرنا جن کو تیار کر کے منافع کمایا جا سکے۔

۲۔ ٹکنیکی عمل: تازہ ترین پیداواری نمونوں سے منڈی میں اپنے مال کی کھپت کو بڑھانا اور نئے آرڈر وصول کرنا۔

۳۔ معاشرتی عمل: کمپنی کے تمام اراکین کو اُس تسلی اور ترقی کے مواقع فراہم کرنا جو معاشرتی عمل میں براہ راست شامل ہونے سے مل سکتی ہے۔

۴۔ سیاسی عمل: دوسرے مردوں اور عورتوں کو معاشی صحت اور معاشرتی ذمہ داری کی جیتی جاگتی مال سے متاثر کرنا۔

اس ''دولت مشترکہ'' نے ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا جو دائرے کو مربع میں تبدیل کرنے سے زیادہ مشکل تھا۔ اس نے حقیقی جمہوریت اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کو یکجا کر دیا۔ اس تنظیم میں ہر شخص کو یہ موقع حاصل ہے کہ وہ خود کو اعلیٰ انسانیت کی سطح پر پہنچا سکے۔ اپنی ذات سے ماوراء ہونے کا طریق کار یہاں ذاتی و رانفرادی نہیں ہے کہ ایسے مواقع تو انسان کو ہیں اور بھی مل سکتے ہیں۔ یہاں اعلیٰ انسانی سطح کا حصول تنظیم کے مقاصد سے خود کو آزادانہ مسرت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے سے ممکن ہے۔ اس امکان کو حاصل کرنے میں ابھی تربیت کی ضرورت ہے اور اگر سب نہیں تو بہتیرے کارکنوں نے اس امکان کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیا ہے۔

منافع کی آدھی رقم کا کمپنی سے باہر فلاحی کاموں کے لیے وقف ہونا محض اس بات کی دلیل

نہیں کہ اس سے ان مقاصد کی تکمیل کی گئی جو بالعوم سرمایہ دارانہ معاشرت میں درخورِ اعتنا نہیں سمجھے جاتے ۔ اس نے ''دولت مشترکہ'' کے اراکین میں ایسی معاشرتی بصیرت کو جنم دیا ہے جو روایتی کمپنیوں میں مفقود ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کمپنی نے یہ احتیاط بھی روا رکھی ہے کہ کہیں انفرادی خودغرضی گروہی خودغرضی میں تبدیل نہ ہوجائے۔اس سلسلے میں ٹرسٹیوں کا ایک بورڈ بنایا گیا ہے جس کی حیثیت کم وبیش آئینی حکمران کی ہے۔ کمپنی کے باہر کے ٹرسٹی فیصلہ کن رول ادا کرتے ہیں۔ یہ محض آئین کے ٹرسٹی ہوتے ہیں انتظامات مداخت کے حقوق نہیں رکھتے۔ بنیادی مسائل پر اگر کوئی مناقشہ پیدا ہوجائے تو یہ منصفی کے فرائض انجام دیں گے۔

مسٹر بیڈر کا لایا ہوا یہ انقلاب غیر خونی انقلاب ہے۔ چاروں سمت ہڑتالیں ہوتی رہتی ہیں مگر سکاٹ بیڈر سیفٹر سے یہ اعلان کرسکتے ہیں: ''ہمارے یہاں کوی ہڑتال نہیں ہوئی۔'' اس کے باوجود کہ کمپنی کے اندر ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ ماقصد اور حصول کے درمیان بہت فرق باقی ہے مگر باہر کا کوئی شخص ان کے مقاصد اور عملی طریق کار سے اختلاف نہیں کرسکتا۔ اس کے باوجود سکاٹ بیڈر اور چند اور، ایسے انسانی معاشرے میں جہاں حرص اور رشک کی حکومت ہے، فہم وادراک کے چھوٹے چھوٹے جزیروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قومی ملکیت کی مختلف صورتیں

ایسی معاشرت میں، جہاں معاشی معاملات پر زور دیا جاتا ہے، تین قسم کی متضاد معیشتوں میں سے ایک کا چناؤ ہوسکتا ہے:

۱۔ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت اور مختلف اقسام کی عوامی یا اجتماعی ملکیت کے درمیان۔

۲۔ بازاری معیشت اور مختلف اقسام کی منصوبہ بندیوں کے درمیان اور ۳۔ آزادی اور مطلق العنانیت کے درمیان۔ ان تینوں متضاد صورتوں میں متضاد عناصر کو آپس میں کسی حد تک سلایا جاسکتا ہے؟ کسی حد تک یہ آپس میں ایک دوسرے کی کمیوں کو پورا کرتے ہیں تاہم ان کے میل میں ایک یا دوسرے عنصر کی زیادتی ضرور ہوگی۔

وہ حضرات جو نجی ملکیت کے قائل ہیں یہ کہتے ہیں کہ غیر نجی ملکیت میں منصوبہ بندی اور مطلق العنانیت لازمی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آزادی کا تصور محض نجی شعبوں اور بازار کی معیشت میں ہی مل سکتا ہے۔ اسی طرح وہ، جو اجتماعی ملکیت کے حق میں ہیں، کہتے ہیں کہ اس

میں مرکزی منصوبہ بندی لازمی ہے۔ صحیح آزادی محض قومی ملکیت اور منصوبہ بندی سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہر شخص اپنے ہی نظام کے حوالے سے آزادی کا دعویدار ہے اور برعکس نظام کو ظلم وتشدد، مطلق العنانیت یا انتشار کا منبع قرار دیتا ہے۔

ان بحثوں کی خرابی یہ ہے کہ ان کی صداقت تصورات سے برآمد ہوتی ہے بجائے اس کے کہ تصورات حقائق سے برآمد کیے جائیں۔ آیئے اب ملکیت کے ایسے نظام پر غور کریں جو ایسی بڑی صنعت کے لیے ہو جس میں ملی جلی معیشت کا نمونہ ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ مستقبل کی ضروریات خالص کے بجائے ملی جلی معیشت سے ہی پوری ہوں گی اور یہ بات صنعتی معاشروں کے لیے بالخصوص صحیح ہے۔

میں پہلے بتایا چکا ہوں کہ ترقی یافتہ معاشرے میں نجی شعبے اُس ''انفراسٹرکچر'' سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں جو عوامی اخراجات سے تعمیر کیا جاتا ہے لیکن عوام، جو نجی شعبے کے اخراجات کا ایک بڑا حصہ ادا کرتے ہیں، اس کے منافع براہ راست شریک نہیں ہوتے۔ یہ سارا منافع نجی ہاتھوں میں جاتا ہے اور پھر پبلک کا ہاتھ نجی جیبوں سے اپنی معاشی ضروریات کھینچتا ہے۔ جدید تاجر ہمیشہ یہ رونا روتا رہتا ہے کہ وہ ملک وقوم کی بڑی خدمات سرانجام دیتا ہے۔ ملک اس کا حصے دار ہے۔ جہاں تک منافع کا تعلق ہے اس کا ایک بڑا حصہ ٹیکسوں میں چلا جاتا ہے جو دراصل اس کا یا اس کے حصے دار و کا حق ہوتا ہے۔

میری تجویز یہ ہے کہ حکومت کو بڑی صنعتوں کے منافع کا پچاس فیصد وصول کرنا چاہیے اور وہ ٹیکسوں کے ذریعے نہیں بلکہ نجی صنعت میں پچاس فیصد ملکیت حاصل کرکے۔

ا۔ سب سے پہلے اس سکیم میں آنے والی صنعت کا کم سے کم سائز طے ہونا چاہیے کیوں کہ ہر صنعت میں جب اس کے ملازمین کی تعداد ایک خاص حد سے زیادہ ہو جائے تو اس کا نجی اور فاقی کردار ختم ہو جاتا ہے اور وہ پبلک صنعت بن جاتی ہے اس لیے صنعت کی تعریف ملازمین کی مقررہ تعداد کے حوالے سے ہونی چاہیے۔ مخصوص حالات میں سرمائے یا سالانہ تجارت کی رقم کے حوالے سے بھی صنعت کے سائز کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

۲۔ تمام صنعتوں کو، جو اس سائز یا اس سے کچھ زیادہ ہوں، جوائنٹ سٹاک کمپنی ہونا چاہیے۔

۳۔ بہتر یہ ہوگا کہ ان کمپنیوں کے تمام حصص کو امریکی نمونہ پر ''تو___پار'' حصص میں تبدیل کر دیا جائے۔

MashalBooks.com

۴۔ حصص کی تعداد دگنی کر دینی چاہیے۔ وہ اس طرح کہ جتنے حصص اب تک جاری ہو چکے ہیں اتنے ہی مزید جاری ہوں جو پبلک کنٹرول میں ہوں۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر نجی حصے کے متوازی ایک حصہ پبلک کا بھی ہوگا۔

ان خطوط پر کام ہو تو معاوضہ ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ پبلک کا وہ حق، جس کے تحت منافع پر ٹیکس لگایا جاتا ہے، اب اپنی صورت بدل کر منافع میں براہ راست حصہ دار بننے کے حق میں تبدیل ہو جائے گا۔ یہ تبدیلی اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہے کہ نجی شعبے کی دولت پیداوار میں ایک اہم کردار پبلک کا بھی ہوتا ہے۔

ان پچاس فیصد نئے حصص کو اس ضلع میں، جہاں نجی شعبہ کام کر رہا ہے، مقامی طور پر مقرر کردہ ارکان کی تحویل میں دے دینا چاہیے۔ دو باتیں اہم ہیں۔ اول یہ کہ پبلک کے عمل دخل کو زیادہ سے زیادہ لامرکزی ہونا چاہیے۔ دوم یہ کہ نجی شعبے کو اس معاشرتی ماحول سے جس میں وہ کام کر رہا ہے، زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ مقرر کردہ ارکان کو، جن کی تحویل میں پچاس فیصد حصص ہوں گے، مقامی باشندوں کا نمائندہ ہونا چاہیے۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ منتخب شدہ (سیاسی) اشخاص یا مقامی انتظامیہ کے افراد کو اس کام کے لیے سب سے زیادہ اہل سمجھا جائے۔ وہ حقوق، جو ملکیت کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں، عام طور پر دو قسم کے ہوتے ہیں: ۱۔ انتظامی حقوق، ۲۔ مالیاتی حقوق۔ عام حالات میں اگر موجود انتظامی معاملات میں سرکاری ہاتھوں کی مداخلت ہو تو نہ صرف یہ کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ نقصان کا زیادہ اندیشہ ہے لہٰذا نجی شعبوں کے منتظمین کو جب تک غیر معمولی حالات نہ پیدا ہوں آزادی سے کام کرنے دینا چاہیے۔ پبلک حصص کو ووٹ دینے کے حقوق نہیں ہونے چاہییں۔ ان کی حیثیت محض معلومات حاصل کرنے اور خاموش مشاہدہ کرنے والوں کی ہونی چاہیے۔ غیر معمولی حالات میں پبلک حصص کو باعمل بنانے کی ضرورت محسوس ہوت و مقررہ کردہ آبزرور عدالت سے چارہ جوئی کرے گا اور محدود مدت کے لیے پبلک حصص کو باعمل بنائے گا۔

بسا اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ پبلک کے مفادات کے تحفظ کے لیے انتظامیہ میں اعلیٰ سرکاری افسروں کو داخل کر دینا چاہیے۔ یہ بہت معصوم اور غیر عملی تصور ہے۔ انتظامی ذمے داریوں کی تقسیم نہیں بلکہ پبلک کے سامنے جوابدہ ہونے کا احساس ہی کسی تجارتی شعبے کو پبلک مفادات کی طرف متوجہ کرے گا۔ سرکاری انتظامیہ اور تجارتی کارگزاریاں دو مطلق علیحدہ باتیں

ہیں جنہیں آپس میں گڈ مڈ کرنے سے نقصان کا اندیشہ زیادہ ہے۔

البتہ مالیاتی معاملات میں پبلک حصص کے نگرانوں کو محتاط ہونا چاہیے۔ اس لیے بھی کہ اب ہی مالیاتی منافع ٹیکسوں کا بدل ہیں۔ منافع کا آدھا حصہ آپ ہی آپ پبلک مصص کیمد دمیں چلا جائے گا۔ پبلک حصص کو قائم رکھنے کے لیے یہ شرط بھی ہونی چاہیے کہ انہیں بیچا نہیں جا سکے گا۔ ان کی بناء پر قرض کا مسئلہ بعد میں طے کیا جا سکتا ہے۔

میری اس سکیم کا مقصد یہ ہے کہ بڑے پیمانے کے تجارتی شعبوں کو معاشرتی ماحول سے حتیٰ الامکان قریب لایا جائے۔ یہی مقصد اہل کاروں کی نوعیت بھی طے کرے گا۔ صنعتی ملکیت کے مسائل کو سیاسی جھگڑوں سے دور رکھنا بہتر ہے۔ انہیں سرکاری افسروں سے بھی دور رکھنا چاہیے کیوں کہ ان کی تقرری ہی مختلف مقاصد کے لیے کی گئی ہے۔ اس کام کے لیے شہریوں کی ایک اص کونسل ہونی چاہیے جیسے میں یہاں ''معاشرتی کونسل'' کے نام سے پکاروں گا۔ اس کونسل میں سرکاری یا سیاسی مداخلت کے بغیر ایک چوتھائی اراکین مقامی ٹریڈ یونین کے نمائندے ہونے چاہییں۔ ایک چوتھائی کو مقامی آجروں کی نمائندہ کرنی چاہیے۔ ایک چوتھائی پیشہ وروں کی انجمن کے نمائندوں پر اور آخری چوتھائی مقامی شہریوں کے نمائندوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔ ان اراکین کی نمائندگی کی مدت پانچ سال ہونی چاہیے اور تمام نمائندوں کا پانچواں حصہ ہر سال ریٹائر ہو جانا چاہیے۔

معاشرتی کونسل کو مالیات پر پورا اختیار حاصل ہونا چاہیے۔ یوں تو اسے قانونی ضابطوں کے مطابق ہی کام کرنا ہوگا مگر کونسل کو ہر ممکن آزادی چاہیے۔ اس اعتراض کا کہ فنڈ کو خرچکرنے کے سلسلے میں کونسل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، فوری جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ایسی صورت میں مقامی حکمرانوں یا مرکزی حکومت پر کس گارنٹی کے تحت اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس معاشرتی کونسل، جو مقامی آبادی کی نمائندگی کرتی ہے، یقینی طور پر معاشرتی ضروریات کو پیش نظر رکھ خرچ کرے گی جس کی توقع مقامی افسروں یا مرکزی حکومت کے اہل کاروں سے نہیں کی جا سکتی۔

موجودہ نظام کو اس نظام میں تبدیل کرنا، جسے ہم نے یہاں پیش کیا ہے، زیادہ مشکلات پیدا نہیں کرے گا۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں معاوضے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کمپنی کے آدھے حصص ان ٹیکسوں کے متبادل کے طور پر خریدے جانے ہیں جو منافع پر لگائے جائے نیز یہ کہ ایک خاص حد سے بڑی تمام کمپنیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھا جائے گا۔ کمپنیوں کے

سائز کا معاملہ پہلے سے طے ہونا چاہیے اور شروع شروع میں محض چند بڑی بڑی فرموں کو متاثر ہونا چاہیے تاکہ تبدیلی تجرباتی ہو اور درجہ بدرجہ ہو۔ اگر اس سکیم میں شامل بڑی صنعتیں ٹیکسوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ منافع دینے لگیں تو اس سے بڑے پیمانے کی صنعت کی طرف رجحان کم ہو جائے گا اور یہ معاشرے کے لیے نیک فال ہوگی۔

ایسی کمپنیوں کے لیے بہت سے مسائل پیدا ہوں گے جو مختلف مقامات اور اضلاع میں تجارت کر رہی ہوں گی جن میں بین الاقوامی کمپنیاں بھی شامل ہوں گی لیکن دو اصول اچھی طرح سمجھ لیے جائیں تو کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوگا۔ ۱۔ نفع پر لگنے والے ٹیکس کو پبلک حصص میں بدلا جاتا ہے۔ ۲۔ پبلک مداخلت مقامی سطح کی ہوگی یعنی اس مقام کی جہاں کمپنی کام کر رہی ہے اور اسکے کارکن رہتے ہیں، سفر کرتے ہیں اور ہر قسم کی پبلک سہولتوں سے فیض یاب ہوتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض پیچیدہ مسائل ایسے ہوں گے جن میں قانون دانوں اور حساب کتاب کے ماہروں کے لیے دلچسپ کام پیدا ہو جائے گا مگر کوئی اہم مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔

ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ اس سکیم میں آنے والے کمپنی نیا سرمایہ کیسے اکٹھا کر سکے گی؟ اس کا جواب بھی آسان ہے۔ اگر ہر نجی حصے دار کے حصے کے برابر حصہ پبلک ملکیت میں جائے گا تو بادی النظر میں یہ بات منصفانہ نہیں کہ نجی حصے دار تو اپنے حصے کے لیے رقم دے جب کہ پبلک کا حصہ مفت ہو۔ اس بات کا جواب یہ ہوگا کہ پوری کمپنی اب اپنے منافع پر کوئی ٹیکس ادا نہیں کرے گی۔ وہ منافع، جو نئے سرمائے پر ہوگا، اس پر بھی کوئی ٹیکس نہیں لگے لہٰذا یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو حصص پبلک ملکیت میں جاتے ہیں وہ محض ان ٹیکسوں کے بدلے میں جاتے ہیں جنہیں بصورت دیگر یقینی طور پر ادا کرنا ہوتا۔

مندرجہ بالا تجاویز کو ''آئین سازی کے فن'' میں ایک تجربہ سمجھ لیجیے۔ اس سے بڑے پیمانے کی صنعتوں میں بغیر کسی انقلاب کے انتہائی اہم تبدیلیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس صورت میں نہ تو مرکزیت کی خرابیاں ہوں گی اور نہ ہی نجی شعبے کی لچک کی جگہ نوکر شاہی کا بوجھل انتظام ہوگا۔ اس نظام کو تجرباتی انداز میں درجہ بدرجہ نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ پہل بڑی بڑی صنعتوں سے ہو اور آہستہ آہستہ نیچے کی طرف آیا جائے۔ یہاں تک کہ عوامی مفادات کا اچھی طرح تحفظ ہو جائے۔ بڑے پیمانے کی موجودہ صنعتیں بھاری بھرکم ٹیکسوں اور لاتعداد قانونی موشگافیوں کے باوجود عوام کے مفاد کے لیے کچھ نہیں کر رہیں۔

MashalBooks.com

حرف آخر

اپنی سائنسی اور ٹکنیکی قوتوں کو بروئے کار لانے کے جوش میں جدید انسان نے پیداوار کا ایسا نظام وضع کر لیا ہے جو فطرت کو برباد کر رہا ہے اور ایسا معاشرہ تعمیر کیا ہے جو انسانیت کو مسخ کر رہا ہے۔ یہ سمجھا جا رہا ہے کہ دولت کی فراوانی ہر شے کا علاج ہے۔ دولت ہی مقتدر ہے۔ اگر اس سے غیر مادی اقدار مثلاً انصاف، ہم آہنگی، حسن یا صحت نہیں خریدی جا سکتیں تو کم از کم یہ ان کی ضرورت کے احساس کو کم کر دے گی یا پھر ان کی کمی کی تلافی کر دے گی۔ پیداوار کی ترقی اور دولت کا حصول جدید دنیا کے اعلیٰ ترین مقاصد حیات بن چکے ہیں جن کے مقابلے میں دیگر مقاصد، خواہ ان کے بارے میں کتنا ہی زبانی جمع خرچ ہوتا رہے، ثانوی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اعلیٰ ترین مقاصد کے لیے کسی جواز کی حاجت نہیں۔ تمام ثانوی مقاصد کو بالآخر اپنا جواز اس مناسبت سے پیش کرنا پڑتا ہے وہ اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کے لیے کیا خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔

یہی فلسفہ مادیت ہے۔ یہی فلسفہ یا مابعد الطبیعیات آج کے واقعات کی زد میں ہے۔ پہلے کسی معاشرے میں، دنیا کے کسی حصے میں ایسا زمانہ کبھی نہیں آیا جب بزرگوں نے مادیت کو چیلنج نہ کیا ہو اور ترجیحات کے دوسرے نظام کا درس نہ دیا ہو۔ زبان مختلف ہوگی، علامتیں مختلف ہوں گی مگر پیغام ہمیشہ ایک رہا ہے: ''پہلے تم خدا کی سلطنت کی تلاش کرو، پھر یہ تمام چیزیں (مادی اشیاء جن کی تمہیں ضرورت ہے) تمہیں مل جائیں گی۔'' گویا وہ اسی سرزمین پر ملیں گی دوسری دنیا میں نہیں جو ہمارے تخیل سے باہر ہے۔ آج یہ پیغام ہمیں محض ولیوں اور بزرگوں ہی نہیں بلکہ طبعی واقعات سے بھی مل رہا ہے۔ یہ ہم سے ''تباہ کاری''، ''نسل کشی''، ''آلودگی'' وغیرہ کی زبان میں بات کر رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی مملکت کے بارے میں کہے گئے الفاظ میں یہ محض وعدہ ہی نہیں دھمکی بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر تم وہ سلطنت تلاش نہیں کرو گے تو یہ تمام چیزیں، جن کی تمہیں ضرورت ہے، تمہارے ہاتھ نہیں آئیں گی۔ حال ہی میں ایک مصنف نے سیاست یا معیشت کے حوالے کے بغیر، لیکن جدید دنیا کے حوالے سے، یہ لکھا ہے:

> اگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آدمی بحیثیت مجموعی صداقت سے زیادہ سے زیادہ پہلو تہی کر رہا ہے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ صداقت آدمی کے گرد ہر چہار جانب سے اپنا گھیرا زیادہ سے زیادہ تنگ کرتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اس کو چھونے کے لیے

ماضی میں تو پوری عمر کی ریاضت کی ضرورت ہوتی تھی اب محض یہ کافی ہے کہ آدمی اس سے جھجکنا چھوڑ دے۔ تاہم یہ بات کتنی مشکل ہے۔

اگر آج ہمیں یہ یقین ہے کہ جدید دنیا کی تباہ کن قوتیں صرف دولت، تعلیم اور تحقیق کے وسائل کو بروئے کار لا کر قابو میں لائی جا سکتی ہیں، آلودگی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے، جنگلات کو تحفظ دیا جا سکتا ہے، قوت کے نئے وسائل کی تلاش کی جا سکتی ہے اور پر امن بقائے باہمی کے لیے موثر سمجھوتا ہو سکتا ہے تو ہم یقیناً صداقت سے بھاگ رہے ہیں۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ دولت، تعلیم اور تحقیق کے علاوہ وہ بہتیری اور چیزیں بھی ہر تمدن کی ضرورت ہیں لیکن آج جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ اُن مقاصد کو بدلنے کی ہے جنہیں ان ذرائع سے حاصل کرنا مقصود ہے۔ اس بات کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایسا طرزِ حیات اختیار کریں جو مادی اشیا کو ان کا اصل مقام عطا کرے: یہ مقام ثانوی ہے اولیں نہیں۔

''پیداوار کی منطق'' نہ زندگی کی منطق ہے اور نہ معاشرت کی۔ یہ تو محض ان دونوں کا مختصر سا ضمنی جزو ہے۔ وہ تباہ کن قوتیں جو اس نے آپ شکار کی ہیں، تب تک قابو نہیں آ سکتیں جب تک خود پیداوار کی منطق کو قابو میں نہ لایا جائے۔ اگر جان لیوا ہتھیاروں کی پیداوار کو انسان کی تخلیقی قوتوں کا حاصل قرار دیا جاتا رہے تو پھر تخریب کاری کو روکنے کی کوشش لاحاصل ہوگی۔ اگر پیداوار اور استعمال اس پیمانے، پیچیدگی اور تشدد کا حامل ہو جو کائنات کے قوانین سے مطابقت نہ رکھے تو آلودگی کے خلاف کوئی جنگ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی واضح ہے کہ وسائل کے خاتمے کو روکنے کے امکانات کم سے کم ہیں نیز دولتمندوں اور غریبوں کے درمیان کسی ہم آہنگی کے قائم رکھنے کی توقعات بھی نہیں ہیں جب تک یہ تسلیم نہ کر لیا جائے کہ ''کافی'' ہونا بہت اچھا ہے اور ''کافی سے زیادہ'' ہونا خرابی ہے۔

امید کی ایک کرن اس بات میں نظر آتی ہے کہ ان گہرے معاملات کی کچھ بصیرت آہستہ آہستہ پیدا ہو رہی ہے جس کا اظہار بعض سرکاری و نیم سرکاری بیانات میں ہو رہا ہے۔ ایک سرکاری رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ معاشرے، جن میں ٹکنالوجی کا استعمال زیادہ ہے ''اپنی اقدار کو تبدیل کریں اور اپنے سیاسی مقاصد کو بدل لیں۔'' یہ مسئلہ اب ''اخلاقی چناؤ'' کا ہے کہ ''اعداد و شمار خواہ کتنے بھی ہوں اس کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔۔۔ ساری دنیا کے نوجوان روایتی اقدار کے متعلق بنیادی سوالات اُٹھا رہے ہیں اور یہ اُس عام بے چینی کی علامت ہے جو ہمارے صنعتی تمدن سے مختص ہے۔'' آلودگی پر قابو حاصل کرنا چاہیے اور

انسانی آبادی اور وسائل کے استعمال کو مستقل طور پر قائم رہنے والے توازن کی صورت اختیار کرنی چاہیے۔ ''جب تک یہ نہ ہوگا کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اب وقت بہت کم ہے۔ تمدن کا زوال محض سائنس فکشن بن کر رہے گا، ہماری آئندہ نسلوں کا تجربہ بن جائے گا۔''

لیکن یہ سب کس طرح ہوگا؟ ''اخلاقی چناؤ'' کی کیا کیا صورتیں ہیں؟ کیا یہ محض اتنی سی بات ہے کہ ''ہم صاف ستھرے ماحول'' کے لیے کتنی رقم خرچ کر سکتے ہیں؟ جیسا کہ رپورٹ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ انسان کے پاس چناؤ کیا آزادی یقیناً ہے۔ اس پر میلانات یا پیداوار کی منطق یا کسی اور ضمنی منطق کی پابندی نہیں ہے لیکن اس پر صداقت کی پابندی ضرور ہے۔ مکمل آزادی، محض صداقت ہی سے وابستہ ہے۔ وہ لوگ، جو آج ہم سے اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہم ''موجود نظام کی غلامی سے اپنے تخیل کو آزاد کریں'' وہ بھی یہ نہیں بتاتے کہ صداقت کو کیسے پہچانا جائے؟

یہ نہیں کہ بیسویں صدی کے انسان سے یہ تقاضا کیا جا رہا ہو کہ وہ ان صداقتوں کو دریافت کرے جو پہلے دریافت نہیں ہوئیں۔ عیسائی روایت میں نیز تمام اعلیٰ انسانی روایات میں صداقت کا بیان مذہبی انداز میں ہوا ہے جو آج کے بیشتر انسانوں کے لیے تقریباً ناقابل فہم ہے۔ عیسائیت میں جن اعلیٰ انسانی اوصاف کا ذکر ہوا ہے ان میں سے ایک شعور بھی ہے جس کے معنی ہیں ''حقیقت پر خاموشی سے غور۔'' اسی غور و فکر کے دوران شعور کی بنیاد پر ہی وہ دوسرے اوصاف حاصل ہوتے ہیں جنہیں عدل، ثابت قدمی اور توازن کہتے ہیں۔ شعور میں یہ بات بھی شامل ہے کہ صداقت کے علم کو حقیقت سے متعلق فیصلوں میں بدل دیا جائے۔

عدل کا تعلق صداقت سے ہے، ثابت قدمی کا خوبی سے اور توازن کا حسن سے جب کہ شعور میں یہ تینوں باتیں مضمر ہیں۔ ایسی حقیقت پسندی، جو یہ ظاہر کرے کہ صداقت، خوبی اور حسن مبہم اور داخلی چیزیں ہیں جنہیں معاشرتی یا انفرادی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے طور پر نہیں اپنایا جا سکتا یا پھر یہ کہ وہ کامیابی کے ساتھ دولت اور قوت کے حصول کا طریقہ سکھائے، بالکل ''احمقانہ حقیقت پسندی'' ہے۔ ہر جگہ لوگ یہ سوال کرتے ہیں: ''میں فی الحقیقت کیا کر سکتا ہوں؟'' جواب اتنا ہی آسان ہے جتنا پریشان کن۔ ہم میں سے ہر ایک خود اپنے گھر کی سلامتی کے لیے کام کر سکتا ہے۔ اس کام کے لیے رہنمائی سائنس یا ٹکنالوجی سے نہیں ملے گی۔ ان کی قدر و قیمت تو ان مقاصد سے متعین ہوگی جو یہ چیزیں پورا کرنا چاہتی ہیں۔ ہمیں رہنمائی اب بھی انسان کی روایتی دانش میں ہی مل سکتی ہے۔

MashalBooks.com